اب تک یاد ہے

مائل خیرآبادیؒ

فہرست

مسلمان ہی جنتی

مجھے ان تمام مسلمان بچوں پر ترس آنے لگا جو ان اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جہاں اسلام اور قرآن پر بے سمجھے بوجھے حملے ہوتے ہیں، اور ان حملوں سے ان معصوم بچوں کا ذہن متاثر ہوتا ہے۔

کلام پاک کی تلاوت کرتے کرتے جب میں سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۹۴ پر پہنچتا ہوں تو مجھے وہ گفتگو یاد آجاتی ہے جو میرے اور ابرار احمد نامی بی ایس سی کے ایک طالب علم سے دار المطالعہ میں ہوئی تھی۔ پہلے آپ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۹۴ کا ترجمہ پڑھ لیں۔ ترجمہ یہ ہے:۔

"اور جو اچھے کام کرے، اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت ہونے والی نہیں۔ ہم تو اسے لکھ رہے ہیں۔"

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اچھے کام کرے گا اور وہ مومن بھی ہوگا تو قیامت کے دن بخشا جائے گا، اور اگر مومن نہ ہوگا تو چاہے کیسے ہی اچھے کام کرے جنت میں نہ جائے گا، بلکہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

اب سنیے۔ ایک دن میں دار المطالعہ میں بیٹھا تھا۔ اتفاق کی بات کہ

اُس وقت دار المطالعہ میں میرے سوا کوئی اور نہ تھا۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں دار المطالعہ کا انچارج بھی ہوں۔ تنہائی میں وقت گزاری کے لیے میں جھاڑن سے کتابوں پر پڑی ہوئی گرد جھاڑنے لگا۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکا آیا، میرا نام لیا اور پوچھا۔ "یہ صاحب کہاں ملیں گے ؟" میں نے جھاڑن ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا۔ "تشریف رکھیے اور فرمائیے مجھ سے کیا کام ہے ؟" "اچھا آپ ہی ہیں . . . . صاحب !" کہتے ہوئے سولہ سترہ برس کے نوجوان نے بتایا کہ وہ بی ایس سی کا طالب علم ہے اور اس کا نام ابرار احمد ہے۔ اس نے اپنا پورا پتہ بھی بتایا اس کے بعد کہنے لگا کہ صاحب ! یہ بتائیے کہ ایک غیر مسلم چاہے کتنا نیک ہو، چاہے کیسے اچھے کام کرے لیکن وہ قیامت کے دن جنت نہ پا سکے گا ؟ اور جہنم میں جائے گا ؟ آخر ایسا کیوں ؟ یہ تو صریحاً بے انصافی ہے۔"

ابرار احمد کئی جملے ایک سانس میں کہہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ سوال آپ سے آپ، آپ کے دل میں آیا ہے یا کہیں سُنا ہے ؟" میرے یہ پوچھنے پر ابرار احمد نے بتایا کہ ہمارے کلاس کے ایک غیر مسلم ٹیچر نے بڑے طنز کے ساتھ بھرے درجے میں کہا کہ مسلم یا غیر مسلم جو بھی اچھے کام کرے اسے جنت ملنا چاہیے لیکن قرآن میں ایسا لکھا ہے کہ جنت کے حقدار تو مومن ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ تو کوئی نیائے کی بات نہیں ہوئی۔ کلاس میں ہم چند ہی مسلمان لڑکے ہیں۔ ہمیں بڑی تکلیف ہوئی۔ غور کیا تو ٹیچر کی بات بھی ٹھیک معلوم ہوئی اس لیے کچھ بول نہ سکے۔ اب آپ اس کا جواب دیجیے۔"

ابرار احمد سے یہ سُنا تو مجھے ان تمام مسلمان بچوں پر ترس آنے لگا جو اُن اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جہاں اسلام اور قرآن پر بے سمجھے بوجھے حملے ہوتے ہیں۔ اور ان حملوں سے ان معصوم بچوں کا ذہن متاثر ہوتا ہے میں نے

ابرار احمد سے ٹیچر کا نام پوچھا۔ اس کے بعد کہا:۔

"عزیزمن! کیا پنڈت جی (یعنی ہسٹری ٹیچر صاحب جنہوں نے اعتراض کیا تھا) کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب اللہ تعالےٰ ہر ایک سے اس کے کاموں کا حساب لے گا، قیامت قائم ہوگی۔ آخرت کا دن برحق ہے؟"

ابرار احمد نے جواب دیا۔ "پنڈت جی یہ تو نہیں مانتے۔"

"عجیب بات ہے۔" میں نے ابرار احمد سے کہنا شروع کیا۔ "جو آخرت کو ماننا ہی نہیں، اور اپنی دوڑ دھوپ کو اسی دنیا میں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے یعنی یہ چاہتا ہے کہ جو کچھ ملنا ہے اسی دنیا میں مل جائے تو اسے اسی دنیا میں جو کچھ ملا، وہی سوار تھ رہا۔ اور جس اچھے کام کا بدلہ اس دنیا میں نہ پا سکا، وہ تو اس کے نظریے سے بے کار گیا، کیونکہ وہ آخرت اور آخرت کے دن کے حساب وکتاب کو ماننا ہی نہیں۔"

"ذرا اور وضاحت کیجیے۔" ابرار احمد نے خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا "اچھا اس بات کو مثالوں سے سمجھیے۔ ایک آدمی ہے اس نے اپنے دوستوں یا رشتہ داروں یا کسی اور سے پوچھ پوچھ کر بہت کچھ پڑھ لیا، وہ سمجھ بوجھ بھی اچھی رکھتا ہے۔ تعلیم کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں ہیں، لیکن اس نے کسی سرکاری یا سرکار سے منظور شدہ (رکاگنائزڈ) اسکول میں نام لکھا کر نہیں پڑھا ہے اور سرکاری امتحان پاس نہیں کیا تو اسے سرکاری محکمۂ تعلیم سے علمی سند (سارٹیفکٹ) نہیں ملتی اور نہ مل سکتی ہے اور صحیح یہ ہے کہ ملنا بھی نہ چاہیے۔ گورنمنٹ اسے وہ حقوق نہیں دے سکتی جو گورنمنٹ اسکولوں میں یا گورنمنٹ سے منظور شدہ اسکولوں میں پڑھنے والوں کو دیتی ہے۔ بالکل یہی حال اس کا ہے جو اچھے کام تو کرتا ہے مگر اللہ اور اللہ کے رسولوں اور آخرت کے دن سے کوئی تعلق نہیں

رکھتا، اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنے طالب علم ہونے کا کوئی سارٹیفکٹ حاصل نہیں کیا تو پھر اسے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے حق کیوں دیا جائے؟

ابرار احمد یہ مثال سن کر مسکرایا۔ میں سمجھ گیا کہ بات اس کی سمجھ میں آ رہی ہے میں نے کہا ایک مثال اور سنیے۔ ایک آدمی ہے بڑا لمبا تڑنگا، قوی اور جفاکش وہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن یہی قوی ہیکل آدمی اجازت کے بغیر پلیٹ فارم پر قلی گیری کرے گا تو نفع کے بدلے نقصان اٹھائے گا۔ ریلوے کے افیسران اسے جیل کی ہوا کھلائیں گے۔ بالکل یہی حال اس شخص کا ہے جو بڑے سے بڑے اچھے کام تو کرتا ہے لیکن اس کے پاس ایمان کا پرمٹ یا لائسنس یا نمبر نہیں ہے تو پھر جس طرح بلا پرمٹ والے قوی ہیکل کی وہ محنت جو اس حال میں پلیٹ فارم پر کرے، بے کار جائے گی، اور بے کار ہی نہ جائے گی بلکہ الٹی آہنیں گلے پڑیں گی۔ یہی حال اچھے کام کرنے والے بے ایمان کا ہونا چاہیے۔ وہ جہنم میں نہ جائے گا تو اور کیا اس پر پھولوں کی بارش ہونا چاہیے؟''

ابرار احمد پھر مسکرایا۔ بولا ''کتنی صاف اور سیدھی بات ہے، مگر کس طرح ہمارے ٹیچر نے ہمیں بہکایا۔'' ابرار اٹھ کر جانا چاہتا تھا کہ اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ پوچھنے لگا کہ کیا غیر مسلم کو اس کے اچھے کاموں کا بدلہ ملتا ہی نہیں؟''

''ملتا کیوں نہیں، مگر بس اسی دنیا میں جو کچھ مل جائے مل جائے۔ باقی اکارت۔ جیسا کہ ہم آپ آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک شخص نوکری کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ اپنے لیے سفارشیں کرواتا ہے تو اسے نوکری مل جاتی ہے۔ ایک شخص ممبری کے لیے کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنا پروپگنڈہ کرواتا ہے اس میں دھن دولت خرچ کرتا ہے۔ الکشن کے داؤں پیچ کام میں لاتا ہے وہ ممبر ہو جاتا

ہے۔ ایک شخص نام کے لیے پل بنواتا ہے، اسکول بنواتا ہے، دھرم شالے اور مسافر خانے بنواتا ہے۔ ایک طرف مسجد کے لیے چندے دیتا ہے، دوسری طرف مندر پر بھی پیسہ نچھاور کرتا ہے۔ اس طرح دوڑ دھوپ کرتا ہے تو اس کی شہرت ہو جاتی ہے۔ پھر جب وہ مر جاتا ہے تو اس کا نام تو رہ جاتا ہے لیکن اس نام سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اپنے نام اور اپنی شہرت سے، اپنی ممبری سے اور اپنی نوکری سے بس اسی دنیا میں کچھ نفع اٹھائے تو اٹھا لے۔ آنکھ بند ہوئی کہ سب اکارت ہے اس کے لیے۔ کاش کہ وہ صاحبِ ایمان ہوتا اور اللہ کو خوش کرنے کے لیے کرتا تو اس زندگی کے بعد جب آخرت میں اللہ کے حضور پہنچتا تو اللہ اس سے خوش ہوتا اور اسے جنت میں جگہ دیتا۔"

ابرار احمد پوری طرح بات سمجھ گیا۔ اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر آیا اور کہنے لگا: "جناب! کوئی آخرت کو مانے یا نہ مانے۔ اگر آخرت برحق ہے تو یہ بھی برحق ہونا چاہیے کہ جو اس دنیا میں اچھے کام کرے اسے اس کا بدلہ وہاں بھی دیا جائے۔" میں نے کہا: "جہاں تک بدلے کا سوال ہے، اسے ملنا چاہیے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اس کا اچھا کام اللہ کی نظر میں بھی اچھا ہو؟"

"یہ کیا بات ہوئی! ذرا وضاحت سے سمجھائیے۔" ابرار احمد چکرایا۔ میں جانتا تھا کہ ابرار احمد نوجوان ہے زیادہ باریک اور علمی باتوں کو سمجھ نہ سکے گا۔ میں نے کہا۔ "اچھا، اسے مثال سے سمجھیے!

"ایک بادشاہ ہے، بہت بڑا بادشاہ۔ ہفت اقلیم کا بادشاہ۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی ہر اقلیم کا انتظام اپنے نائب سے ہی کرائے گا۔ نائب کا نام کچھ بھی رکھ لیجیے چاہے اسے گورنر جنرل کہیے، چاہے وائسرائے۔ ابرار میاں ۱۹۴۷ء سے پہلے جبکہ آپ بچے ہوں گے، ہمارے ملک میں بھی ملکہ وکٹوریہ ایڈورڈ ہفتم، جارج پنجم

اور جارج ششم وغیرہ کی طرف سے گورنر جنرل اور وائسرائے ہی ہوا کرتے تھے۔
معلوم ہے کیا طریقہ ہوتا ہے ہفت اقلیم کے بادشاہ کا؟ وہ اپنا قانون اور سکہ
وائسرائے کو دے دیتا ہے اور اسے حکم دیتا ہے کہ جا ہمارا قانون اور سکہ چلا،
ہمارے وفادار رہنا۔ باقی سارے امورِ مملکت میں جس طرح چاہے میری رعایا کی
خبرگیری کر۔ اس عہد کے ساتھ فرض کیجیے کہ ایک وائسرائے ایک اقلیم میں پہنچا
اس نے بڑا اچھا انتظام کیا۔ رعایا کے فائدے کے لیے سڑکیں بنوائیں۔ تعلیم کیلیے
اسکول کھلوائے، صحت کے لیے اسپتال قائم کیے، رعایا کی جان و مال کی حفاظت
کے لیے بہترین تھانے اور چوکیاں بنوائیں اور ان میں خاص خاص ذمہ دار لوگوں کو
انچارج اور سپاہی مقرر کیا۔ نیک دل وائسرائے نے ملک سے رشوت، چوری،
لوٹ مار، بلیک مارکیٹ اور ایسی ساری برائیاں ختم کر دیں۔ ہر طرف امن اور سکھ کا
بول بالا ہو گیا۔ لیکن ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ رعایا کی زبان وائسرائے کا نام جپنے لگی۔ وائسرائے
نے کسی وجہ سے، اپنی غفلت سے یا کسی خیال سے رعایا کو یہ نہیں بتایا کہ یہ سارا
احسان شہنشاہ ہفت اقلیم کا ہے، میرا نہیں ہیں تو اس کے حکم سے یہ سب کر رہا
ہوں۔ اچھا پھر جب بچہ بچہ وائسرائے کا گرویدہ ہو گیا تو وائسرائے نے، کس
وائسرائے نے؟ اسی اچھے، بہترین اور نیک وائسرائے نے یہ بھی کیا کہ اپنے
بادشاہ کا قانون توڑ کھا الگ، اب فیصلے من مانے کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک
دن شہنشاہ کا سکہ بھی اٹھا دیا۔"

شہنشاہ ہفت اقلیم کے محکمہ سی، آئی، ڈی نے یہ رپورٹ شہنشاہ کو دی۔
اب بتائیے ابرار صاحب! شہنشاہ اس نیک اور اچھے وائسرائے کے ساتھ کیا
برتاؤ کرے گا؟

"اُسے غدار قرار دے گا اور قید کرا دے گا، یا قتل کرا دے گا۔" ابرار احمد نے

جواب دیا۔اب میں نے مسکرا کر کہا: "ابرار میاں! تو یہ بات حق ہے کہ آخرت میں شہنشاہ عالم اپنے خلیفہ (نائب) یعنی انسان کے ساتھ یہی برتاؤ کرے گا، کوئی کیسا ہی اچھا او زنیک انسان ہو، اگر وہ آخرت کے دن غدار ثابت ہوگا شہنشاہ عالم اسے معاف نہ کرے گا، اور جو اپنے اللہ کو اپنا اللہ اور اپنے رب کو رب مانے گا تو خواہ اس سے بڑے سے بڑا گناہ ہو جائے امید ہے کہ اللہ اسے معاف کر دے گا اور پھر اپنی جنت میں جگہ دے گا۔ یہ بالکل ناانصافی کی بات ہے کہ غدار اور وفادار کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ابرار احمد کو بالکل شرح صدر ہوگیا کیونکہ اس کے بعد مجھ سے پوچھنے پھر نہ آیا۔

توکیا آپ کا خیال یہ ہے کہ وہ بزرگ محض تفریحِ طبع اور کھیل کے طور پر شکار کے لیے جاتے تھے؟ بلا ضرورت شکار کرتے تھے؟ اپنے تیروں سے جانوروں کو زخمی کر کے گرا دیتے تھے؟ اور اُن کے تڑپنے کا مزا لیتے تھے؟

ایک بار میں اپنے ایک عزیز دوست سے ملنے سنبھل (ضلع مراد آباد) گیا تھا۔ وہاں اچانک جماعتِ اسلامی ہند کے امیدوار رکنیت حاجی ..... صاحب اسسٹنٹ ایگریکلچر انسپکٹر سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے خیریت پوچھی تو حاجی صاحب نے بتایا کہ "یہاں سے تبادلہ گورکھپور ہو گیا ہے، اور میں آج کل چارج دے رہا ہوں۔"

اس گفتگو کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ "ہمارے انسپکٹر صاحب (یعنی پنڈت .... جی ایگریکلچر انسپکٹر) نے بہت سی اسلامی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اُن سے متاثر بھی ہیں، لیکن اسلام میں گوشت خوری کے جواز کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، اور میں انھیں اپنے جوابات سے مطمئن بھی نہ کر سکا۔ چلیے ملاقات کراؤں۔"

میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ "بحث ومناظرہ مجھے بالکل نہیں آتا، نہ میں اس مسئلے میں نیا رہی ہوں۔ لہٰذا اچھا یہ ہے کہ میری ملاقات نہ کرائیں۔" لیکن حاجی صاحب نہ مانے، پکڑ ہی لے گئے۔ لے جا کر انسپکٹر صاحب سے تعارف کرایا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ حضرت جماعت اسلامی ہند کے رُکن بھی ہیں۔

انسپکٹر صاحب فوراً میری طرف متوجہ ہو گئے اور مختصر گفتگو کے بعد گوشت خوری کا مسئلہ زیر بحث لے آئے۔ میں نے بحث ومناظرہ سے فرار کی راہ اختیار کی، تو انسپکٹر صاحب نے فرمایا کہ غرض وغایت مناظرہ نہیں ہے، صرف سمجھنا مقصود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوستانہ گفتگو میں وہ جواب مل جائے جو وجہ اطمینان ہو۔

میں نے دیکھا کہ انسپکٹر صاحب پنڈت ہوتے ہوئے نہایت شستہ اردو بول رہے تھے۔ میں نے اس کا اظہار لفظوں میں کیا تو حاجی صاحب نے بتایا کہ انسپکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کی اونچی اونچی کتابیں پڑھی ہیں اور خوب سمجھ کر پڑھی ہیں۔ کتاب "پردہ" پڑھنے کے بعد آپ نے اپنی بیوی کو پردہ کرانا بھی شروع کر دیا ہے۔

یہ سن کر انسپکٹر صاحب کی معقولیت کا قائل ہونا پڑا۔ اب میں نے عرض کیا کہ "میں گوشت خوری کے مسئلے پر زیادہ افہام وتفہیم تو نہیں کر سکوں گا آپ فرمائیں تو کچھ موٹی موٹی باتیں عرض کر دوں، لیکن گزارش یہ ضرور ہے کہ میں جو کچھ عرض کروں اُسے آپ سماعت فرمائیں۔" "ضرور، ضرور" انسپکٹر صاحب نے بہت بڑھا کر کہا، اور اپنی کرسی کسی قدر اور میری طرف کر کے بیٹھ گئے اس وقت وہاں میں تھا، انسپکٹر صاحب تھے، حاجی صاحب تھے، اور

گوشت کھاتے بھی تھے؟"

انسپکٹر صاحب اور پاس بیٹھے ہوئے ایک ہندو نوجوان نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ وہ بزرگ محض تفریح طبع اور کھیل کے طور پر شکار کے لیے جاتے تھے؟ بلا ضرورت شکار کرتے تھے؟ اپنے تیروں سے جانور کو زخمی کر کے گرا دیتے تھے اور ان کے تڑپنے کا مزا لیتے تھے؟ میں ان بزرگوں کو ایسا نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بوقت ضرورت ہی شکار کو جاتے تھے، ورنہ وہ اتنے رحمدل تھے کہ بلا ضرورت مچھر کو مارنا بھی ناپسند کرتے ہونگے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا سوال ان بزرگوں پر ایک سخت بہتان ہے۔"

میں نے دیکھا کہ انسپکٹر صاحب نے ایک لمبا سانس لیا۔ وہ ایک عجیب کرب میں مبتلا نظر آنے لگے۔ میں نے عرض کیا "اب بتائیے، اگر میں سچ کہتا ہوں تو پھر وہ لوگ جو ان بزرگوں کو اپنا ہیرو اور پیشوا بالفاظ دیگر خدا مانتے ہیں ان کو تو گوشت کھانا چاہیے نہ کہ الٹے معترض ہونا چاہیے؟ پھر اگر میں آگے بڑھ کر یہ بھی عرض کر دوں کہ رامائن کے مصنف بالمیک جی نے ایک موقع پر گائے کی بچھیا ذبح کر کے کھالی تھی تو وہ شخص انکار نہیں کر سکتا جو اس زمانے کی تاریخ سے واقف ہے۔"

"بات تو آپ سچ کہتے ہیں،" انسپکٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ پاس بیٹھا ہوا ایک نوجوان کچھ بولنا چاہتا تھا، انسپکٹر صاحب نے اسے روک دیا۔ اور مجھ سے کہا "کچھ اور فرمائیے؟" میں نے عرض کیا۔

"ہمارے اور آپ کے پاس کسی بات کے جواز کے لیے دو ہی دلیلیں ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ہمارے بزرگوں سے کیا نقل ہوتا چلا آیا ہے؟ دوسرے

یہ کہ ہماری عقل اس کے جواز کے لیے کیا جواب دیتی ہے؟ نقل اور پیروی کی بات میں عرض کر چکا۔ اب رہی عقل کی بات۔ تو آپ تو ایگریکلچر انسپکٹر ہیں، فرمائیے، اگر آپ سواحل کے علاقوں کے انچارج بنا دیئے جائیں، یا کسی کوہستان یا ریگستان کے باشندوں کی معاش کے منتظم ہوں تو وہاں کے لوگوں کی بھوک کا مسئلہ کیسے حل کریں گے؟ مجبوراً آپ مچھلی اور چوپایوں کو غذا بنانے کی ترغیب دیں گے، یا زیادہ سے زیادہ اگر آپ احتیاط برتیں گے تو ڈاکٹروں کی مدد سے یہ دیکھیں گے کہ کس جانور کا گوشت انسان کے لیے مضر ہو سکتا ہے۔ بس اُسے ناجائز قرار دیں گے۔ تو پھر سوچیے کہ ہمارے جس خدا نے یہ دنیا بنائی اور جس نے ساری چیزوں کو پیدا کیا، اس سے بڑھ کر کون ڈاکٹر ہو سکتا ہے؟ اور کون یہ جان سکتا ہے کہ فلاں جانور کا گوشت مفید ہے اور فلاں جانور کا مُضر؟ الحمد للہ کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے لیے مفید تمھی غذا ہی حلال کی ہے۔ اور سُور، کتّا، شیر، بھیڑیا اور ایسے سارے جانور حرام کر دیئے ہیں جن کا گوشت کھانا انسان کے لیے مضر ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ نے اسلامی لٹریچر بہت کچھ پڑھا ہے لیکن ہنوز قرآن اور حدیث کا مطالعہ بغور نہیں کیا۔ میری رائے ہے کہ آپ قرآن اور حدیث کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ کچھ دیر کے بعد انسپکٹر صاحب نے پوچھا:

"کب تک قیام رہے گا"؟

میں نے بتایا "کل چلا جاؤں گا۔" اس کے بعد میں اجازت لے کر چلا آیا۔

دوپہر کو حاجی صاحب میری قیام گاہ پر تشریف لائے، اور فرمایا کہ "انسپکٹر صاحب نے بعد عصر چائے پر مدعو کیا ہے۔" عصر کی نماز پڑھ کر میں اپنے عزیز دوست (جن کے مکان پر ٹھہرا تھا) کے ساتھ انسپکٹر صاحب کے دولت کدہ پر گیا۔ حاجی صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انسپکٹر صاحب بڑے خلوص سے پیش آئے۔ اور دوسرے دن میں وہاں سے چلا آیا۔

بے بنیاد الزام

اگر سیتا جی یا ان جیسی کسی خاتون کا مقدمہ اسلامی عدالت میں پہنچے
تو جج وہ فیصلہ ہرگز نہ کر سکے گا جو سیتا جی کے بارے میں ہوا۔ اُن
سیتا جی کے بارے میں جنھوں نے ایک باوقار اور وفادار بیوی
کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔

راتوں کی تنہائیوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھے دیر تک نیند نہیں آتی
جب نیند نہیں آتی تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں اپنے ماضی کی کتاب کی ورق گردانی
شروع کر دیتا ہوں، یا یوں کہیے کہ میری کتاب ماضی کے صفحات آپ سے آپ
میرے سامنے آنے لگتے ہیں۔ پھر اس کے عنوانات میری نظروں سے گزرتے
ہیں۔ عنوانات سامنے آتے ہی مضمون خود بخود یاد آجاتا ہے۔
میری کتاب ماضی کے ایک صفحہ پر میرے ایک استاد پنڈت چھوٹے
لال جی کا نام جلی حروف میں لکھا ہے۔ پنڈت چھوٹے لال جی بڑے قابل
استاد اور بڑے لائق انسان تھے۔ علمی مزاج رکھتے تھے۔ اپنے کچھ مخصوص
شاگردوں کو اسی طرح سوچنے کی ترغیب دیا کرتے جس طرح خود سوچتے تھے۔
اپنے مذہب کے بڑے پابند اور مشہور کتاب "رامائن" کے عاشق تھے اکثر

اس کتاب کے رموز و نکات شاگردوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

رامائن سے پنڈت جی کے انہماک کو دیکھ کر مجھے بھی اس کتاب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے تو رامائن کے مصنف تلسی داس جی کی فصاحت و بلاغت کا گرویدہ ہوا۔ اس کے بعد سری رام چندر جی کے کردار اور ان کی سنجیدگی نے دل میں گھر کیا، اور میں آں موصوف کی سیرت سے متعلق کرید کرنے لگا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میری کرید کڑی تنقید کا روپ دھارن کر لیتی، لیکن پنڈت جی جانتے تھے کہ اُن کا شاگرد تنقید برائے تنقیص نہیں کر رہا ہے اس لیے بڑے اطمینان اور انبساط کے ساتھ تسلی بخش جواب دیتے۔ بار بار کی کرید یا افہام و تفہیم سے میرے دل میں سری رامچندر جی کا بڑا احترام پیدا ہو گیا جو آج بھی باقی ہے۔ اسی لیے میں رامچندر جی کو خدا کا اوتار تو نہیں، ہاں، پراچین بھارت کی سب سے بڑی ہستی اور یہاں کا بہترین ہیرو سمجھتا ہوں۔

ایک بار پنڈت چھوٹے لال جی نے رامائن کا وہ ادھیائے (باب) میرے سامنے پیش کیا جس میں کسی مجہول شخص نے اپنی بیوی سے لڑتے وقت یہ کر یہہ جملہ کہہ دیا کہ "ہٹ میں رام نہیں ہوں کہ سیتا جی راون کے یہاں دس گیارہ برس رہیں، اور پھر رام نے انہیں اپنی بیوی بنا لیا۔"

اس مجہول شخص کے اس طنز کی لغویت اظہر من الشمس ہے لیکن یہی طنز جب رام چندر جی کے کانوں میں پہنچا تو آں موصوف نے اس پاکباز خاتون اور انتہائی پتی ورتا بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ اس طرح اس غریب کو دو بار بن باس اختیار کرنا پڑا۔ اور پھر اسی بن باس کی حالت میں ان کی عبرتناک موت واقع ہوئی۔

رامائن کا یہ باب پڑھ کر مجھے بے حد تکلیف ہوئی۔ میں اس تکلیف کو چھپا

نہ سکا، میں نے پنڈت جی سے استفسار کے طور پر بڑے غمناک لہجے میں کہا۔

"سری رامچندر جی کا جو احترام اب تک میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ باب پڑھ کر سخت مجروح ہوا، انہوں نے سیتا جی سے اچھا سلوک نہیں کیا اور نہ انصاف ہی سے کام لیا۔ وہ سیتا جی کی بے داغ سیرت سے بخوبی واقف اور مطمئن تھے پھر بھی ایک مجہول شخص کے طنز کرنے پر کسی دلیل کے بغیر اتنا بڑا اقدام کر ڈالا۔ کاش کہ اس طرح کا مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہوتا تو فیصلہ کچھ اور ہوتا۔"

پنڈت جی نے فیصلے کی تشریح چاہی، تو میں نے اسلامی قانون کی وہ دفعہ سنائی جو سورۂ نور کی ابتدائی آیتوں میں سے کسی ایک میں یوں ہے کہ اگر کوئی کسی عورت پر تہمت لگائے اور چار گواہ نہ لائے تو اس کے اسی کوڑے مارو۔

میں نے کہا "یقیناً اسلامی عدالت سے سیتا جی بے داغ بری ہو جاتیں اور اس مجہول شخص کو اسی کوڑوں کی سزا بھگتنی پڑتی۔"

مجھ پر سیتا جی کی مظلومیت کا اتنا اثر ہوا کہ پھر میں نے کوئی بات نہیں کی۔ پنڈت جی بھی خاموش رہے، اس وقت کوئی جواب نہیں دیا۔ کئی دن کے بعد بتایا کہ اصلاً یہ واقعہ بالمیکی رامائن میں نہیں ہے اور نہ تلسی داس جی نے ہی نظم کیا، بلکہ بعد کے کویوں نے اس حصے کو خود ہی تصنیف کیا اور خود ہی نظم کر کے ضمیمہ کے طور پر رامائن میں شامل کر دیا۔

میں نے پنڈت جی کا یہ جواب سننے کو تو سن لیا، لیکن اس سے میرا غم ہلکا نہ ہوا۔ مجھے اب بھی جب رامائن کا یہ باب یاد آتا ہے تو سخت رنج ہوتا ہے، اور میں یہی کہتا ہوں کہ اگر سیتا جی یا ان جیسی کسی خاتون کا مقدمہ اسلامی عدالت میں پہنچے تو جج وہ فیصلہ ہرگز نہ کر سکے گا جو سیتا جی کے بارے میں ہوا۔ ان سیتا جی کے بارے میں جنہوں نے ایک باوقار اور وفادار بیوی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔

داڑھی

آپ سب نوجوان ہیں، آپ کو خوبصورتی کا غلط تصوّر دیا گیا۔ سندرتا گالوں کو استرے سے چھیلنے سے نہیں پیدا ہوتی۔ سندرتا تو اپنے جسم کے اندر کی اس سب سے بڑی طاقت کا عطیہ ہے جسے مادۂ تولید اور ویرج کہتے ہیں۔

کبھی کبھی کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہے جو اس طرح یاد رہ جاتی ہے کہ پھر نہیں بھولتی۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہے جو مجھے اس وقت ضرور یاد آجاتا ہے جب میں ٹرین میں سفر کرتا ہوں، اور نوجوان لڑکے خصوصاً طلبہ کسی داڑھی والے شخص کا مذاق اڑانے میں دلچسپی لے رہے ہوتے ہیں۔

میرا واقعہ یوں ہے کہ ایک بار میں کانپور سے اپنے گھر آ رہا تھا۔ کانپور سے لکھنؤ آکر ٹرین بدلنا پڑی۔ لکھنؤ میں، میں جس ڈبے میں بیٹھا تھا آگے چل کر ڈالی گنج میں ادیل (لکھیم پور کھیری) کالج کے کچھ طلبہ آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک مسلمان تھا، باقی غیر مسلم۔ غیر مسلموں میں ایک نوجوان طالب علم ایسا بھی تھا جسکی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی، اور اس نے داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ یہ سب آکر میری سیٹ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اب اسے اتفاق کہیے یا کچھ اور، داڑھی والا غیر مسلم نوجوان

آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا میرے پاس بیٹھنا تھا کہ ان طلبہ میں سے مسلم طالب علم نے برجستہ یہ مصرع پڑھا ؎

خوب نمٹے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یہ مصرع سنتے ہی سارے طالب علم ٹھٹھا لگا کر ہنس پڑے۔ میں سمجھ گیا کہ ان نوجوانوں کے نزدیک ایک دیوانہ تو ان کا وہ ساتھی ہے جس نے چہرے پر داڑھی چھوڑ رکھی تھی، اور دوسرا میں کیونکہ میرے چہرے پر بھی الحمد للہ داڑھی اچھی خاصی تھی، اور جسے چھوڑے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً طلبہ فقرے چُست کرتے رہے۔ ان کا مخاطب تو ان کا وہ ساتھی تھا جس نے داڑھی رکھی تھی، لیکن پس پردہ زد میں، میں بھی تھا۔ ہوتا یہ کہ کوئی ایک لڑکا کوئی فقرہ چُست کرتا اور سب ہنس دیتے، یا ایک لڑکا اپنے داڑھی والے ساتھی کو یوگی، سنیاسی، سادھو جی، رشی، مُنی، جٹایو، اور ایسے ہی مختلف ناموں سے نوازتے اور سب ہاں میں ہاں ملا کر داد دیتے اور ہنستے۔ بیچارا داڑھی والا نوجوان اپنے ساتھیوں کے طنز سے بے حد بے چین تھا۔ میں اس وقت انتہائی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان نوجوان طلبہ کو کس طرح نصیحت کی جائے۔ آخر میں نے ایک ترکیب سوچ لی۔ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا:

"میرے خیال میں اگر آپ سب داڑھی کے مسئلے پر باقاعدہ ڈبیٹ کریں تو اس سے دو فائدے ہوں گے، آپ کی ذہانت بڑھے گی، معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح تو آپ کی ذہانت کو فائدہ نہیں ہو رہا ہے کہ آپ کا ایک ساتھی ایک بات کہتا ہے اور آپ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔"

میری اس بات پر مسلم طالب علم نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا: "ملا جی آپ صحیح کہتے ہیں۔" اور اس کی داد اپنے ساتھیوں سے لینا چاہتا تھا، مگر وہاں سب

مجھے دیکھ رہے تھے اور کوئی مسکرایا تک نہیں۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی طلبہ کو یہی مشورہ دیا کہ راستہ کٹنے کی بڑی اچھی شکل ہے۔

ڈبے میں پوری سنجیدگی چھا چکی تھی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد ایک لڑکے نے کہا:۔

" تو آپ ہی جس پر کار کہیں ویسے وچار کیا جائے۔"

معاملہ مجھ پر ہی ڈال دیا گیا۔ میں نے کہا۔" آدھے طلبہ تو داڑھی کی موافقت میں بولیں اور آدھے مخالفت میں۔"

داڑھی کی موافقت میں بولنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ حتیٰ کہ وہ سنیاسی مہراج بھی داڑھی کی موافقت میں بولنے کے لیے تیار نہ تھے جنہوں نے نوجوانی میں یہ" روگ" پال لیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

ڈبے میں بیٹھے ہوئے چند پڑھے لکھے اشخاص نے بات چیت میں حصہ لیا، اور یہ طے ہوا کہ سارے لڑکے داڑھی کی مخالفت میں بولیں، اور صرف میں موافقت میں۔ میں نے کہا۔" تو یہ صورت ہونا چاہیے کہ آپ اپنے میں سے ایک ذہین طالب علم کو اپنا نمائندہ چن لیں، وہ بات کرے، آپ سب اسے مشورے دیں۔ سب لوگ بولیں گے تو ڈیبیٹ تو نہ ہوگی، بازار گی" ہم نے چیخ" ضرور ہوگی۔"

چلیے طے ہوگیا۔ لڑکوں نے مسلم طالب علم کو اپنا نمایندہ چنا۔ لیکن میں نے ان کا کمزور پہلو ان پر واضح کر دیا کہ یہ مسلم طالب علم تو اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی خاموش ہو جائے گا، جب کہ میں یہ کہوں گا کہ" داڑھی رکھنا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔" یہ سن کر مسلم طالب علم شرما کر پیچھے ہٹا، اور دوسرا طالب علم آگے بڑھ آیا، جو اپنے حرکات وسکنات سے بڑا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا۔" یہ داڑھی تو اس وقت کے لوگوں کی یادگار ہے جب

استرے کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اب تو مہذب قوموں میں اس کا رواج نہیں رہا۔"
میں: "اس کا مطلب یہ ہے کہ داڑھی رکھنا غیر مہذب قوموں کا شعار رہا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا اپنے ان بزرگوں کے متعلق جو سری رام چندر جی جیسے مہان منش کے گرو رہے، اس وقت اُسترہ ایجاد ہو چکا تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ لوگ ٹھوڑی کے آس پاس کا حصہ منڈواتے تھے۔"
طالب علم: "آپ کا اشارہ گرو وشسٹ جی اور بالمیک جی اور ایسے ہی دوسرے رشیوں اور منیوں کی اُور ہے؟"
میں: "جی ہاں! میرا مطلب یہ ہے کہ آپ داڑھی پر طنز کر کے اپنے پوروجوں کا مذاق اڑاتے ہیں؟"
طالب علم: "وے سب تو تپ کے کارن داڑھی رکھتے تھے۔"
میں: "تپ تو بڑی عبادت ہے؟"
نوجوان طالب علم گلا صاف کرنے کی غرض سے کھنکھارنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ علمی حیثیت سے مفلس ہے بے چارہ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ آج کل کے اسکول اور کالج سبھی علمی حیثیت سے کورے کے کورے ہی ہیں اس غریب کا کیا قصور؟ اس کے ایک ساتھی نے اُسے اشارہ کیا کہ کہے "آج کے بدھمان اور ودوان داڑھی کے مخالف ہیں۔"
میں: "یہ بتائیے کہ ہمارے ملک کا وہ بدھمان اور ودوان منش کون ہے جس کا لوہا دنیا کے بدھمانوں اور ودوانوں نے مانا اور اسے نوبل پرائز دیا؟"
مجھ سے یہ سن کے ڈبہ کے کئی مسافر مسکرانے لگے، اور ان کی زبان سے "خوب، خوب" نکلا۔ لڑکے بھی شکست خوردہ ہنسی ہنسنے لگے۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے کہ میں رابندر ناتھ ٹیگور کو کہہ رہا ہوں۔ اب انھوں نے سائنسدانوں

اور ڈاکٹروں کو آڑ بنایا۔

میں : "اب جب آپ اپنے اویل کالج جائیں تو سائنس روم میں لگی ہوئی سائنسدانوں کی تصویریں ضرور دیکھیں، اور یہ دیکھیں کہ کس کس کے داڑھی ہے اور کس کے نہیں۔ پھر یہ دیکھیں کہ ان میں کس کا پایہ اونچا ہے! رہی یہ بات کہ ڈاکٹری اصول سے داڑھی رکھنا غلط ہے تو یہ بات آپ نے یوں ہی کہہ دی۔"

پھر میں نے بتایا کہ تمام ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں طرف کنپٹیوں کی رگوں کے اوپر کسی دھاردار چیز سے چھیلا نہ جائے۔ اس سے بینائی اور باہ پر بڑا برا اثر پڑتا ہے۔

کئی لڑکے : "صاحب ! داڑھی چاہے کتنی ہی لابھ دائک ہو، لیکن اس سے سندرتا بلیا میٹ ہو جاتی ہے۔"

اس بات پر ڈبے کے بیٹھے ہوئے مسافر ایک دم ہنس پڑے اور یہ بات کہنے والے طلبا جھینپ سے گئے۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی تھی۔

میں نے کہا : "آپ سب نوجوان ہیں۔ آپ کو خوبصورتی کا غلط تصور دیا گیا ہے۔ سندرتا گالوں کو استرے سے چھیلنے سے نہیں پیدا ہوتی۔ سندرتا تو اپنے جسم کے اندر کی اس سب سے بڑی طاقت کا عطیہ ہے جسے مادۂ تولید اور ویرج کہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا :

"افسوس ہے کہ ہمارے نوجوان خصوصًا کالجوں کے طالب علم اس اصل قوت کو نوجوان ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے چہروں پر وہ نور کہاں سے پھوٹے جسے واقعی خوبصورتی کہتے ہیں ؟ ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی اور صورت ہی نہیں کہ اُسترے سے گالوں کی کیلیں نکلوا کر

انھیں چکنا کریں، اور بس۔"

لڑکے خاموش ہو چکے تھے۔ ان کو خاموش دیکھ کر میں بھی خاموش ہو گیا پھر جب میں ایک اسٹیشن پر اترنے کے لیے اپنا سامان اتارنے لگا، تو یہ لڑکے اس طرح پیش آئے جیسے وہ سب میرے شاگرد ہوں۔

عورتوں کی فطرت

میرا خیال تو یہ ہے کہ نوے فی صدی کام تو آپ دل کی ناگواری کے باوجود کرتی ہیں۔ ان میں کچھ کے لیے تو آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کو خدا کی خوشنودی درکار ہے، اور کچھ میں سماجی جکڑ بندیوں نے آپ کو مجبور کر دیا ہے، اور بعض میں ایسی مصلحتیں ہیں کہ اگر آپ ایسا نہ کریں تو معاشرے میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے .... تو؟

مقامی جماعت نے محسوس کیا کہ خواتین میں دعوتی کام کو تیز تر کرنے کیلیے کارکن خواتین کو موجودہ تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تربیت دی جائے چنانچہ یہ احساس تجویز کی صورت میں ہفت روزہ اجتماع میں پیش کیا گیا۔ تجویز پاس ہوگئی ساتھ ہی یہ جائزہ لیا گیا کہ مقامی طور پر کون کون سی کارکن خواتین تربیت کے لیے منتخب کی جائیں؟ خواتین کا انتخاب بھی عمل میں آگیا۔ اب سوال یہ پیش ہوا کہ ان خواتین کو کون تربیت دے؟ رفقا نے میرا نام پیش کیا۔ میں نے اپنی کم علمی کا عذر کیا۔ مجھے حیرت ہے کہ مقامی امیر نے میرے عذر کو قبول نہیں کیا اور حکماً مجھے اس کام کے لیے مامور فرما دیا۔ امیر کے حکم کی سرتابی میں گناہ سمجھتا

ہوں۔ میں نے مجبوراً منظور کر لیا۔ میں نے ان خواتین کا ایک مخصوص اجتماع منعقد کیا اور طے کیا کہ یہ تربیتی اجتماع ہفتے میں ایک روز ہوا کرے گا۔ اسکے بعد میں نے مقامی امیر اور دیگر تجربہ کار رفقا کے مشورے سے ایک تربیتی کورس مرتب کیا۔ اس کورس کے بارہ سبق تھے جو عمل میں آنے کے بعد بیس ۲۰ ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خواتین کی تربیت کے لیے بیس اجتماعات منعقد کرنے پڑے اور اس میں تقریباً چھ ماہ صرف ہوئے۔

یہ میعاد ختم ہو گئی۔ اس زمانے کی بہت سی باتیں یاد رہ گئیں اور یاد رہیں گی۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جس کا اظہار کرنا میں اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے بارے میں ہمارے بہت سے رفقا گو مگو کی حالت میں ہیں اور اسکے بارے میں اطمینان چاہتے ہیں۔

کارکن خواتین کے اس تربیتی کورس میں ایک سبق تھا "اسلام کا معاشرتی نظام" اصل میں اسی سبق میں مجھے بڑی محنت کرنی پڑی۔ اور بعض اوقات اچانک ایسے معاملات سامنے آئے کہ اگر اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے نہ نوازتا تو میں سخت ناکام ہوتا۔ اسی سبق نے مجبور کیا کہ میں اسے کئی ہفتے چلاؤں۔

ہوا یہ کہ ایک دن ایک خاتون نے "تعدد ازدواج" پر اعتراض کر دیا اور اپنے سوال کو ان الفاظ میں پیش کیا کہ "چونکہ ہمیں اکثر غیر مسلم خواتین سے گفتگو کرنے کا سابقہ پڑ جاتا ہے۔ غیر مسلم خواتین اسلام کے اس مسئلے پر قابل اطمینان جواب مانگتی ہیں تو ہمیں چپ ہی نہیں بلکہ شرمندہ بھی ہونا پڑتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس میں اشکال کیا ہے؟" میرے اس سوال پر آٹھ کی آٹھوں خواتین خاموش ہو گئیں۔ میں نے پھر پوچھا تو کہا گیا کہ آپ اس موضوع پر مختصر تقریر فرما دیں تو اسی میں غالباً ہمارے اشکال کا حل نکل آئے گا۔

میں تقریر کے لیے تیار نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ تقریر سے مسئلہ حل نہیں ہوگا اور پھر انہیں پوچھنا پڑے گا۔ میرے انکار پر اب خواتین میں یہ کھس پھس ہونے لگی کہ "بھابی" ہماری بات اپنے لفظوں میں اٹھائیں۔ تربیتی کورس حاصل کرنے والی خواتین کی بھابی صاحبہ وہ خاتون ہیں جو میری شریک حیات ہیں۔ یہ بی صاحبہ جھٹ تیار ہوگئیں اور نپے تلے لفظوں میں کہہ دیا کہ "اسلام میں مردوں کو بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرنے کی اجازت ہماری فطرت کے خلاف ہے"۔

میں نے دوسری خواتین سے پوچھا "کیا آپ کا بھی یہی سوال ہے؟"

سب نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "تو پھر میں کیا کروں؟ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ جب اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی طرف سے اجازت ہے تو اب فطرت کے خلاف اور موافق ہونے کا سوال ہی کیا؟"

"مگر سوال یہ ہے کہ ہم مسلمان عورتوں کے لیے تو "تسلی" کے لیے یہ جواب کافی ہے۔

اب سبھی خواتین یکے بعد دیگرے بولنے لگیں۔ ایک خاتون نے یہاں تک فرما دیا کہ آپ کا (یعنی میرا) یہ جواب تو ہمارا منہ بند کرنے کے لیے ٹھیک ہے مگر آپ بتائیے کہ غیر مسلم خواتین کو کس طرح مطمئن کیا جا سکتا ہے، جبکہ عورتوں کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ ان کا شوہر اُن کی موجودگی میں دوسری شادی کرے؟

میں نے کہا کہ "اگر کسی انسان کی پسند اور ناپسند کا سوال ہے تو برائے مہربانی آپ اپنے صبح سے لے کر شام تک کے مشاغل کی فہرست بنا ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کاموں میں کتنے کام ایسے ہیں جو آپ بخوشی انجام دیتی ہیں؟ اور کتنے کام ایسے ہیں جو طوعاً و کرہاً، اور کتنے ایسے جنھیں آپ دلی نفرت کے باوجود

کرتی ہیں؟"

"بھابی صاحبہ! اب آپ ہی آج ہماری وکالت کیجیے"۔ خواتین نے کہا، اور "بھابی صاحبہ" واقعی پیروی کے لیے تیار ہوگئیں۔ فرمانے لگیں:-

"ہم دن بھر سارے کام نہایت خوشی سے کرتے ہیں۔"

اس جواب پر میں ہنس پڑا، ادھر پردے کے اندر تمام خواتین کی ہنسی کی آواز گونجی اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ "بھابی صاحبہ" بھی مسکرا رہی ہیں۔

میں نے عرض کیا۔ "معاف کیجیے گا۔ اب ذرا دن بھر کے کاموں کی فہرست پر نظر ڈال جائیے۔ سب سے پہلے یوں نظر ڈالیے۔ صبح ہوتی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی اور بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ صبح کی خواب آور ہوا کے جھونکے آتے ہیں اور انہی کے ساتھ ہمیں اور آپ کو بھی نیند کے جھونکے آتے ہیں۔ اتنے میں صبح کی اذان ہوتی ہے اب ہمیں بالکل پسند نہیں کہ اس خوشگوار اور لطیف ہوا سے مستفید نہ ہوں اور اپنی نیند توڑ کر اٹھیں مگر آپ کیا کرتی ہیں، چارپائی کو چھوڑتی ہیں، کیوں؟"

"اس لیے کہ نماز پڑھیں" کسی خاتون نے پردے کے اندر سے کہا میں نے کہا "یوں نہ کہیے بلکہ یہ کہیے کہ خدا کے حکم کی وجہ سے آپ اٹھتی ہیں اور خدا کے حکم ہی کی وجہ سے نماز پڑھتی ہیں۔"

"جی۔" "اچھا" میں نے پھر کہا "اچھا آپ نے ادھر چارپائی چھوڑی، ادھر آپ کے منے میاں نے اپنی "اذان" شروع کردی۔ اب وہ رو رہے ہیں آپ نماز میں مشغول ہیں۔ کیا آپ یہ نماز واقعی اپنی خوشی سے پڑھتی ہیں یا کسی اور کی خوشی مدنظر ہے۔؟"

"اللہ تعالیٰ کی خوشی درکار ہے۔" کسی نے کہا میں اور تفصیل کرنے لگا

اسی طرح آپ کا گرمی کے ہوتے ہوئے کھانا پکانا، بارش میں دھوئیں اور گیلی لکڑیوں میں چولھے میں گھسنا، بچے کا بستر کو گندہ کر دینا، اور پھر آپ کا دھونا، پھر یہ کھٹکا کہ میاں فلاں وقت آ کر چائے پئیں گے یا کھانا کھائیں گے، اور آپ کو اسی وقت اپنا جہیز تیار کرنا ہے، یا کسی سہیلی کے گھر جانا ہے، یا کوئی اور تفریح درکار ہے۔
اب میں زیادہ کیا عرض کروں، غور فرمائیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ نوے فی صدی کام تو آپ دل کی ناگواری کے باوجود کرتی ہیں۔ ان میں کچھ کے لیے تو آپ اس لیے مجبور ہیں کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کو خدا کی خوشنودی درکار ہے اور کچھ میں سماجی جکڑ بندیوں نے آپ کو مجبور کر دیا ہے، اور بعض میں ایسی مصلحت ہے کہ اگر آپ ایسا نہ کریں تو معاشرے میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کرنا یا کہنا چاہتی ہیں لیکن نہیں کہتیں یا نہیں کرتیں۔ کیوں؟ اسی لیے تو کہ گھر میں، پڑوس میں، محلے میں کوئی فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ تو جب اتنے سارے کام آپ ناگواری کے باوجود کرتی ہیں تو معاشرے کی ایک بڑی خرابی کو روکنے کے لیے اگر کوئی مرد دوسری شادی کر لے تو اس میں ناگوار کو گوارا کیوں نہیں کیا جاتا؟ آپ دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے گھروں میں جوان جوان لڑکیاں بیس بیس برس کی، پچیس پچیس برس کی اور تیس پینتیس سال کی کنواری بیٹھی ہیں اور انہیں موزوں و مناسب بر نہیں ملتا، اور ہمارے یہاں ایسے بھی مرد ہیں جو اللہ کے فضل سے مالدار بھی ہیں، صحت مند بھی ہیں دین سے اتنا واقف بھی ہیں کہ بیویوں کے درمیان حتی الامکان انصاف بھی برت سکتے ہیں۔ کیا ہرج ہے اگر ہم معاشرے کی اصلاح کی خاطر جس میں اللہ کی رضا کا حصول ہے، اپنی بہنوں کی خاطر "تعدد ازدواج" پر محض ایمان ہی نہ لائیں، بلکہ اس کے متعلق لوگوں کے ذہنوں کو صاف کریں۔ خصوصاً غیر مسلم جن میں ہندو بہنیں اپنے

سماج میں زیادہ پس رہی ہیں، ان کے دل وذہن کو مطمئن کریں کہ اسلام کا یہ مسئلہ بھی واقعی خواتین کی ہمدردی میں ہے نہ کہ ان پر ظلم ہے۔

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوا تو دیر تک سناٹا رہا۔ پھر کسی نے پیچھے سے میری بیوی سے کہا:۔

"بھابی! بھائی جان سے یہ اور کہیے کہ پھر اس کے کیا معنیٰ ہیں کہ اسلام دین فطرت کہلاتا ہے؟ اور بھائی جان نے جو کچھ فرمایا وہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم صبح سے شام تک نوے فیصدی کام فطرت ہی کے خلاف کرتے ہیں۔"

"میں نے آپ کا سوال سن لیا"، میں نے کہا۔ "یہ کیوں کہتی ہیں کہ فطرت ہی کے خلاف ہم کام کرتے ہیں؟ میں نے تو پسند اور ناپسند کاموں کے بارے میں عرض کیا۔ میں نے تو یہ عرض کیا کہ ہم صبح سے شام تک اپنی خواہشات کے باوجود بہت سے کام ایسے نہیں کرتے یا نہیں کر پاتے جو کرنا چاہتے ہیں۔ دراصل آپنے یہ سوال اس لیے اٹھایا کہ آپ فطرت کے معنیٰ نہیں جانتیں اور جو لوگ اسلام کے اس مسئلے کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے۔ تو آپ فطرت کے معنیٰ بھی تفصیل کے ساتھ سمجھ لیں۔"

میں نے کہا:۔

"دیکھیے، کچھ باتیں تو ہمارے آپ کے اندر ایسی ہیں جن میں آسان لفظوں میں کہا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ وہ قدرت کی طرف سے لے کر آتے ہیں جیسے بچہ پیدا ہوتا ہے تو فوراً روتا ہے، اگر نہیں روتا تو سمجھا جاتا ہے کہ اسے کوئی مرض لاحق ہے تو یہ نومولود بچے کی فطرت ہے۔ اس طرح دکھ کے موقع پر غمگین ہونا، خوشی کے موقع پر خوش ہونا اور ایسی ہی دوسری باتیں ایسی ہیں جو سارے انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ دراصل قدرت کا ایک عطیہ ہیں۔ اسی طرح آپ دیکھتی ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ

انسان مل جل کر رہتا ہے اور اسی کو پسند کرتا ہے۔ گو مل جل کر رہنے میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ لڑتے بھڑتے بھی ہیں، مگر تمدنی زندگی سے فرار کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی قدرت کا عطا کردہ جذبہ ہے۔ اصل میں فطرت اللہ کے اسی عطیہ کا نام ہے۔

اب لیجیے انسانی تہذیب اس بات کو پسند کرتی ہے کہ اگر ایک شخص پاس بیٹھا ہے تو اس کی طرف پاؤں کر کے سامنے سامنے کوئی نہ لیٹے۔ انسانی تہذیب کی تمام ایسی باتیں ہماری فطرت میں داخل ہو گئیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور باتیں ہیں جو اچھے رواجوں کے تحت آ گئی ہیں اور لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔ مثلاً شادی ہو تو کھلم کھلا، اسلام نے تو اسے بھی خاص مسئلہ بنا لیا۔ غیر مسلم بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی فطری باتیں ہی ہیں جن کی طرف کسی نہ کسی نبی نے ضرور رہنمائی کی ہوگی۔

اب رہیں وہ باتیں جن کا ذکر اس وقت آپ نے چھیڑا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کا تعلق "خواہشات" سے ہے، پسند اور ناپسند سے ہے۔ گوارہ کرنا اور ناگوارہ کرنے سے ہے۔ جسے آپ نے سمجھ لیا۔ میرا خیال ہے کہ فطرت کے اصل معنوں میں یہی ضروری ہے کیونکہ ہماری تمدنی زندگی کا تقاضا ہے کہ "تعدد ازدواج" کو جائز مان لیا جائے۔ حالانکہ میں آپ سے عرض کردوں، مسلمان بھی اشد ضرورت کے موقع پر آج کل کرتا ہے۔ جو لوگ اس مسئلے کو نہیں سمجھتے وہ بھی ناحق ہی موقع بے موقع یہ اعتراض جڑتے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں"، یکے بعد دیگرے کئی خواتین نے شرح صدر کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اب مجھے قید سے رہائی دیجیے۔

میرا مطلب یہ تھا کہ آپ لوگ دوسری طرف چلی جائیں تو میں باہر چلا جاؤں صاحب خانہ خاتون نے کہا۔" آپ جا سکتے ہیں، لیکن بھابی آج دیر میں جائیں گی ــــــ"

میں چلا آیا۔ میری شریک حیات بڑی دیر کے بعد آئیں تو معلوم ہوا کہ آج ان خواتین کی بھابی صاحبہ کا خوب مذاق بنایا گیا یعنی کہا گیا کہ" اب بھائی جان سے کہا جائے گا کہ پہل آپ ہی کریں۔"

مسلمان ہونا باعثِ فخر

دنیا کا وہ کون سا مذہب ہے جو یہ سکھاتا ہے کہ اے انسان! یہ ساری چیزیں تیری خدمت اور سیوا کے لیے ہیں، تو ان سے کام لے یہ تجھ سے کمتر ہیں، ان کے سامنے سر جھکانا اور ان کو پوجنا تیری توہین ہے۔

سید..... رضوی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس، عہدے کے اعتبار سے میرے افسر، عمر کے اعتبار سے میرے بزرگ اور تعلقات کے اعتبار سے میرے دوست تھے، معائنہ کرنے آتے تو میرے یہاں قیام فرماتے، اور اس یگانگت کے ساتھ ٹھہرتے کہ میرا بچہ کبھی ان کی گود میں کھیلتا ہوتا اور کبھی ان کے بستر پر سو رہتا۔

مزاج کے اعتبار سے رضوی صاحب بڑے نرم، اخلاقی اعتبار سے بڑے نیک، عہدے کے اعتبار سے بڑے فرض شناس اور تعلقات کے اعتبار سے ہمہ آمیز تھے۔ ہندو، مسلم اور اچھوت، سبھی ان کی عزت کرتے، ان سے محبت کرتے، ان کا احترام کرتے۔ بعض تو اس حد تک احترام کرتے کہ چاپلوسی اور خوشامد کی حد تک پہنچ جاتے۔

خدا جانے لوگوں کا یہ دلی تاثر تھا یا خوشامد یا مبالغہ، کہ کچھ لوگ تو رضوی صاحب کو دیوتا کہتے، اور بعض بہ تنگ اظہار خیال کرتے ہوئے نہ چوکتے کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا رضوی صاحب جیسے بھلے مانس کی توہین ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ذہن کے لوگوں کے نزدیک رضوی صاحب کی یہ انتہائی مدح وستایش تھی، حالانکہ یہ انداز بیان خدا کی ذات ستودہ صفات پر ایک نامعقول حملہ ہے، اس خدا کی ذات پر جو سب کا خدا ہے۔ کوئی اسے چاہے اللہ کے نام سے یاد کرے یا ایشور اور گاڈ کے نام سے پکارے، یا کسی اور اچھّے نام سے۔

مجھے معلوم ہے رضوی صاحب اپنی تعریف سُن کر خوش نہیں ہوتے تھے اکثر مناسب انداز میں ٹوک دیتے یا دوسری طرف متوجہ ہو جاتے۔ ایک بار رضوی صاحب نے میرے یہاں کے اوقات قیام میں خود مجھ سے ایک ایسا واقعہ بیان کیا جو مجھے اب تک یاد ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک دن تشریف لائے تو اسلام کی عظمت و قدر پر گفتگو چھیڑ دی۔ اس کے بعد کہنے لگے:۔

"بھئی، آج پنڈت . . . . . جی سے بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔ یہ گفتگو ایک مسلمان کے لیے ایمان افروز بھی ہے، شاید تم پسند کرو"۔

میں رضوی صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ موصوف نے فرمایا:۔

"پنڈت جی کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ سے روپیہ نکلوانا چاہتے تھے۔ شادی کے دن بہت قریب ہیں، اس لیے چاہتے تھے کہ جلدی روپیہ مل جائے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے۔ میں نے جلد سے جلد اور بروقت نکلوا دیا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے میں پنڈت جی نے حد کر دی۔

"ڈپٹی صاحب! آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔ ایشور نے آپ کو مسلمان

گھرانے میں نہ جانے کیوں پیدا کیا؟ آپ کو تو کسی مہاتما کے گھر جنم لینا تھا۔“

مجھے پنڈت جی کے یہ الفاظِ شکریہ پسند نہ آئے۔ میں نے سوچا۔ انہیں سمجھا دوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا باعث توہین نہیں، بلکہ باعث فخر ہے۔ سنو گے مسٹر۔۔۔! میں نے کس طرح سمجھایا؟“ رضوی صاحب نے واقعہ سنانے کے لیے مجھ کو پھر متوجہ کیا۔ میں نے کہا ”ضرور سنائیے، میں غور سے سن رہا ہوں۔“

رضوی صاحب نے کہنا شروع کیا کہ ”میں نے پنڈت جی کو بالکل اس طرح سمجھایا جیسے ایک استاد، طالب علم کو سبق پڑھاتا ہے۔ اور سوال و جواب کے ذریعہ نفس مضمون ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ میری اور اُن کی گفتگو اس طرح ہوئی:۔

میں: ”پنڈت جی! ذرا یہ بتائیے کہ ایشور نے اس سنسار میں کیا کیا پیدا کیا ہے“؟

پنڈت جی: ”ایشور نے پشوا ور پکشی پیدا کیے۔ بنسپتی اُگائی۔ دھرتی کے اندر کھان پدارتھ (معدنیات) بھر دی۔ ایشور نے ہوا، پانی، مٹی، اور آگ پیدا کی۔ اور اسی نے یہ زمین اور وہ آسمان اور جو کچھ ان میں ہے پیدا کیا۔“

میں: ”ان ساری چیزوں میں انسان کا کیا مقام ہے؟“

پنڈت جی: ”انسان اشرف المخلوقات ہے۔“

میں: ”ٹھیک ہے۔ وہ انسان ہی ہے جو ساری معدنیات، نباتات اور حیوانات کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ معدنیات میں سونا چاندی جیسی دھاتوں کے سکے اور زیور بناتا ہے۔ اور دوسری دھاتوں کو دوسرے ضروری کاموں میں استعمال کرتا ہے۔ نباتات میں سے کچھ کھانے کے مصرف میں لاتا ہے کسی پودے سے روئی حاصل کر کے کپڑا بناتا ہے، جڑی بوٹیوں کو دواؤں میں استعمال کرتا ہے۔

اسی طرح جانوروں میں سے کسی جانور سے دودھ حاصل کرتا ہے، کسی کا گوشت کھاتا ہے، کسی کو ہل میں جوتتا ہے اور کسی کو سواری کے کام میں لاتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ یہ ساری چیزیں انسان کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہیں۔ ٹھیک ہے نا پنڈت جی؟"

پنڈت جی: "جی، بے شک۔"

میں: "اچھا اب یہ بتائیے کہ دنیا کا وہ کونسا مذہب ہے، جو یہ سکھاتا ہے کہ اے انسان! یہ ساری چیزیں تیری خدمت اور سیوا کے لیے ہیں، تو ان سے کام لے، یہ تجھ سے کمتر ہیں، ان کے سامنے سر جھکانا اور ان کو پوجنا تیری توہین ہے؟"

رضوی صاحب نے بتایا کہ اس سوال پر پنڈت جی چپ ہو گئے، تو میں نے خود کہا:۔

"پنڈت جی! دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسان کو اس کا صحیح مقام بتاتا ہے۔ ورنہ دوسرے مذاہب تو انہی چیزوں کے سامنے جھکنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ہی کے دھرم کو پیش کرتا ہوں۔ آپ کا دھرم پتھروں، پیڑوں، جانوروں، پانی اور نہ جانے کس کس کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں انسان سے کمتر درجہ رکھتی ہیں کیا اپنے سے کمتر کے آگے سر جھکانا اور اسے پوجیہ بنانا کوئی فخر کی بات ہے؟ پنڈت جی! اسلام انسان کو عزتِ نفس کی تعلیم دیتا ہے۔"

رضوی صاحب نے اس مقام پر میرا نام لے کر کہا کہ پھر پنڈت جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ ان کا دل اسلام کی قدر و قیمت سمجھ چکا تھا۔ رضوی صاحب یہ گفتگو سنا کر خاموش ہو گئے۔ اور میں اپنی جگہ سوچنے لگا کہ کتنے آسان طریقہ سے رضوی صاحب نے ایک مسئلہ سمجھا دیا؟

سیدھی سی مثال

دیکھیے! میرے پاس یہ سرکاری سیر اسّی تولے والا ہے اسی سرکاری سیر سے میں نے آدھ سیر، پاؤ سیر، ادھ پئی اور چھٹانکی بنالی ہیں۔ یہ دیکھیے پاؤ سیر کا پتھر ہے، یہ دیکھیے آدھ سیر کا، یہ آدھ پاؤ کا اور یہ چھٹانک بھر کا سیر سے کم سودا انہی سے تولتا ہوں۔ اگر کوئی اعتراض کرتا ہے، تو اسّی تولے والے سیر سے، جو سرکاری معیاری سیر ہے تول کر مطمئن کر دیتا ہوں۔

شروع شروع میں جماعت اسلامی ایک ایسے مرحلے سے دوچار ہوئی تھی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء دستور جماعت اسلامی ہند کی دفعہ ۶ پر بڑی زور آزمائی فرمارہے تھے۔ دستور کی دفعہ ۶ یہ ہے، کہ "رسولِ خدا کے سوا کسی کو معیار حق نہ بنائے۔" علمائے کرام نے بڑے بڑے مجمعوں میں اس دفعہ پر اظہار خیال کیا۔ دھواں دھار تقریریں کیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جماعت اسلامی والے رسول خدا کے سوا کسی صحابی کسی تابعی اور کسی ولی کو نہیں مانتے۔ بلکہ اس دفعہ کی رو سے وہ بزرگان سلف کی توہین کے مرتکب ہیں علماء کی سرگرمی کا زور یو، پی میں تھا۔ اور یو، پی کے اندر سب سے زیادہ

مشرقی اضلاع میں ہماہمی رہی۔ اور مشرقی اضلاع میں بستی اور اعظم گڈھ کے اندر تو علماء نے جماعتِ اسلامی ہند کے خلاف گویا آگ ہی لگا دی تھی۔

ضلع بستی ہی کے ایک قدیم دارالعلوم کے مہتمم مولانا..... صاحب تھے اور غالباً اب بھی ہیں۔ ضلع بستی ہی کے ایک حاجی دین محمد صاحب تھے اور غالباً اب بھی ہیں۔ مولانا جماعتِ اسلامی کی دشمنی میں اتنا زیادہ سرگرم تھے کہ ہر جمعہ کو سائیکل پر کسی آبادی میں چلے جاتے۔ مجمع اچھا ملتا جوشیلی تقریر کرتے۔ ثابت کرتے کہ جماعتِ اسلامی والے رسولِ خدا کے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ چاہے وہ صحابۂ کرامؓ ہوں یا بزرگانِ دین، چاہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، چاہے وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ یا شاہ ولی اللہؒ آخر میں کہتے جو صحابہؓ کی توہین کرے، بزرگان دین کا پیرو نہ ہو، وہ اسلامؐ سے خارج ہے وغیرہ وغیرہ مولانا..... نے ایک عرصۂ دراز تک یہ مہم چلائی تھی۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ مولانا.... صاحب سائیکل پر جا رہے تھے، راستے میں حاجی دین محمد صاحب پرچون کی ایک دوکان پر بیٹھے تھے۔ حاجی صاحب نے مولانا کو سلام کیا اور کہا "مولانا! تشریف لائیے، ذرا دم لے لیجیے، پانی وانی پی لیجیے"۔ مولانا دوکان پر تشریف لے گئے۔ حاجی صاحب نے عزت سے بٹھایا، شربت پلایا، پان کھلایا۔ پھر کہنے لگے۔ "مولانا! آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" مولانا نے بتایا کہ.... گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھانے جا رہا ہوں"۔

حاجی صاحب نے کہا، "مولانا! سنا ہے آج کل آپ بہت زیادہ تقریر کر رہے ہیں، یہ معیار والا مسئلہ اتنا تو پیچیدہ نہیں جیسے آپ نے ہوا بنا رکھا ہے اسے سمجھنا اور سمجھانا کوئی مشکل بات تو ہے نہیں، یہ تو ایک معمولی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دیکھیے میرے پاس یہ سرکاری سیر اسّی تولے والا ہے۔ اسی سرکاری سیر سے

ہیں نے آدھ سیر، پاؤ سیر، ادھ پئی اور چھٹانکی بنا لی ہیں۔ یہ دیکھیے، پاؤ سیر کا پتھر ہے، یہ دیکھیے آدھ سیر کا، اور یہ آدھ پاؤ، اور یہ چھٹانک بھر۔ سیر سے کم سودا انہی سے تو لتا ہوں اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو اسی تولے والے سیر سے جو سرکار کا معیاری سیر ہے، تول کر مطمئن کر دیتا ہوں۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" مولانا نے کہا۔ وہ سمجھے تھے کہ حاجی صاحب انکی تائید ہیں کچھ فرمائیں گے لیکن اس کے بعد حاجی صاحب نے کہا:۔

"بس اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے سرکاری سیر ہیں، ہم صحابہ کو اس لیے مانتے ہیں کہ وہ اللہ کے اسی سرکاری اور معیاری سیر پر تل چکے ہیں، بزرگان دین کو ہم اس لیے مانتے ہیں کہ وہ بھی نبی کریمؐ کی بنائی ہوئی کسوٹی پر کسے جا چکے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول خداؐ کے برابر تو نہیں، ہاں پندرہ ساڑھے پندرہ چھٹانک ضرور اُترے، تو انہیں اتنا ہی معیاری ماننا اور بنانا چاہیے۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ چودہ چھٹانک، اور اسی طرح درجہ بدرجہ دوسرے بزرگوں کو معیاری ماننا چاہیے۔ جو تین پاؤ ہوا سے تین پاؤ۔ جو آدھ سیر ہوا سے آدھ سیر، لیکن یہ سب اسی سرکاری اور معیاری سیر پر پرکھے اور تولے جائیں گے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کی شکل ہیں مسلمانوں کے لیے بنایا ہے۔ تو مولانا صاحب! معیار حق تو سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم ہی بنائے جا سکتے ہیں۔ حضورؐ کے بعد جو جس وزن کا ہوگا اسے اتنا ہی معیاری ماننا اور بنانا ٹھیک ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ جماعت اسلامی والے..."

حاجی صاحب پوری بات نہ کہہ سکے تھے کہ مولانا جھٹ سائیکل پر بیٹھے اور جمعہ کی نماز کے لیے گاؤں روانہ ہو گئے۔

حاجی دین محمد صاحب کی اس آسان مثال کا چرچا بستی بھر ہیں ہو گیا اور ہر شخص اسے دہرانے لگا اور علمار کی پھیلائی ہوئی بدگمانی دھوئیں کی طرح اڑ گئی۔

وہ زمانہ

مجھے رہ رہ کر وہ زمانہ یاد آتا ہے، اور یاد آتا رہے گا، جب بدنیت انگریز یہاں راج کرتا تھا، لیکن یہ زمانہ بھی یاد رہے گا جس زمانہ میں ہمارا دیش ہمارے اپنے نیک نیت نیتاؤں کی مٹھی میں ہے۔

والد صاحب نے چنوں کی گٹھری میرے سر پر رکھ دی اور کہا "تم چلو، میں کچھ سودا سلف اور لے لوں، آتا ہوں۔" میں سر پر چنوں کی گٹھری رکھے ہوئے کچھ ہی دور جا سکا تھا کہ میرے سر کی چندیا میں جلن پیدا ہو گئی اور گردن دُکھنے لگی۔ تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی، تو میں نے گٹھری ایک طرف ڈال دی اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔

پیچھے سے والد صاحب آ رہے تھے۔ کچھ سامان اُن کے پاس بھی تھا گٹھری کو زمین پر اور مجھے کھڑے ہوئے روتے دیکھ کر سمجھ گئے کہ لڑکا بوجھ سہار نہ سکا۔ نزدیک آ کر بولے "ارے تو اتنا بڑا ہو گیا اور ایک روپے کے چنے بازار سے گھر تک نہیں لے جا سکتا!"

مجھے یاد نہیں، میں اس وقت کتنا بڑا تھا، لیکن مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ میں بچپن میں کشتی لڑتا تھا۔ اکھاڑے کا کوئی ہم عمر لڑکا کشتی میں کبھی مجھ سے

نہ چبتا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ بچپن میں، میں ایک طاقتور لڑکا تھا۔ عمر تو صحیح نہیں بتا سکتا لیکن بارہ برس کے لگ بھگ ضرور رہا ہوں گا۔

ایک طاقتور لڑکا کم و بیش بارہ برس کا، اور وہ ایک روپیہ کے چنے بازار سے گھر تک نہ لے جا سکا، یہ بات آج رہ رہ کر مجھے یاد آتی ہے، اور شاید یہ عمر بھر یاد آتی رہے گی۔ اس دن تو خصوصیت سے یاد آتی ہے جب میں مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ پانے کے بعد غلہ خریدنے بازار جاتا ہوں، اور وہاں ایک روپیہ کے کم و بیش سوا کلو چنے ملتے ہیں میں ایک روپیہ کے ان چنوں کو دیکھتا ہوں اور اُن چنوں کو یاد کرتا ہوں جنھیں بچپن میں نہ لے جا سکا تھا۔

اسی دن گھر پہنچ کر والد صاحب نے بتایا کہ ان کے بچپن میں ایک روپیہ کے من بھر چنے ملتے تھے۔ جی ہاں، ایک روپیہ کے من بھر۔ اب تو گرانی ہے۔ انگریز کی نیت خراب ہے۔ غلہ سستا کہاں سے ہو۔ اللہ ان انگریزوں کو ملک سے دفعان کرے۔ اس کے بعد ایک کہانی سنائی کہ :-

" ایک راجہ تھا۔ ایک بار وہ شکار کو گیا، وہاں ایک ہرن دیکھا۔ اُس کے پیچھے گھوڑا اڑا دیا۔ کچھ دور پہنچ کر ہرن تو نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ راجہ لشکر سے بچھڑ گیا۔ (اس وقت کہانیوں میں یہی حالات سُنائے جاتے تھے) اب لگی اسے پیاس۔ پاس کہیں پانی نہ تھا۔ وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا سامنے ایک جھونپڑی دکھائی دی، جھونپڑی کے پاس گیا، وہاں ایک سادھو کو بیٹھے دیکھا۔ چار پانچ گائیں چرتی نظر آئیں۔ راجہ نے سادھو سے پانی مانگا۔ سادھو نے پہچانا نہیں، مسافر سے کہا، بیٹھو، راجہ بیٹھ گیا۔ سادھو ایک گائے کے پاس گیا۔ بالٹی بھر دُودھ دوہ لایا۔ راجہ کو دیا۔ راجہ نے آسودہ ہو کر پیا، اب ہوش ٹھکانے ہوئے۔

سادھو سے پوچھا، بابا! گائے کتنا دودھ دیتی ہے؟"

سادھو نے بتایا۔" یہی پانچ چھ سیر۔ اور وہ گائے تو دس سیر دیتی ہے، اور وہ اُدھر والی کلور بارہ سیر دیتی ہے۔"

راجہ یہ سُن کر گائیں دیکھنے لگا۔ ادھر برہمن نے خود پینے کے لیے دُودھ دُوہنا چاہا۔ ایک گائے کے پاس گیا۔ تھن میں ہاتھ لگایا تو ایک قطرہ بھی دُودھ نہ نکلا۔ دُودھ خشک ہوگیا۔ یہ دیکھ کر سادھو مڑا۔ راجہ سے پوچھا " ارے کیا تو راجہ ہے ؟"

راجہ نے کہا " ہاں، میں راجہ ہوں، لیکن آپ نے کیسے جانا ؟"

سادھو نے کہا۔" اتنا ہی نہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری گایوں کی طرف سے تیری نیت خراب ہوگئی ہے۔ یا تو تو انہیں مجھ سے چھیننے کی بات سوچ رہا ہے یا مجھ پر ٹیکس لگانے کی فکر میں ہے۔"

راجہ نے اقرار کیا کہ " ہاں یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن بابا ! یہ تو بتاؤ، تم نے میرے من کی بات کیسے جان لی ؟" راجہ کے یہ پوچھنے پر سادھو نے بتایا :۔

" شاستروں میں لکھا ہے کہ جب راجہ کی نیت میں گھاٹ (کھوٹ) ہوتی ہے تو ملک میں غلہ، دودھ اور ضرورت کی تمام چیزوں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ دیکھو، میری گائے کا دودھ دیکھتے دیکھتے سوکھ گیا، اس سے میں نے سمجھ لیا۔"

یہ سُن کر راجہ بہت شرمایا۔ سادھو سے چھما (معافی) مانگی۔ اتنے میں اسکے لشکری اسے تلاش کرتے ہوئے آگئے اور راجہ چلا گیا۔"

والد صاحب یہ کہانی کہہ کر چپ ہوگئے۔ اس کے بعد یوں کہنا چاہیے کہ مدتیں گزریں، زمانہ ہوگیا، اب نہ والد صاحب ہیں اور نہ وہ زمانہ۔ بدنیت انگریز ہمارے ملک سے جا چکا۔ اب ہمارا ملک آزاد ہے۔ اب ہمارے نیک نیت نیتا، دیش کے کرتا دھرتا ہیں، دیش کی باگ ڈور ہم نے ہی ان کے ہاتھ میں دی ہے، ہم نے ہی ان کو چُن کر اوپر پہنچایا ہے۔ ہمارے یہ نیتا ہر سال اعلان پر

اعلان کرتے ہیں کہ دیش کی پیداوار، کاریگری اور ہر چیز خوب بڑھ رہی ہے۔ ہم یہ ہر سال سنتے ہیں لیکن دیکھتے یہ ہیں کہ ہر چیز دن پر دن گراں ہوتی چلی جارہی ہے۔ کسی چیز میں ذرا بھی تو برکت نہیں رہی روپیہ ادھر آیا اُدھر پُھر ہوگیا۔ یہ بات کیا ہے؟ اس بدنیت راجہ کی طرح ہمارے نیتا ہو نہیں سکتے۔ پھر ہم ان کو ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں، ہم نے جو چُنا ہے اُن کو۔ اپنی لاج ہے ہمیں جو۔ مگر پھر کارن؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

میرے بچپن میں ۲۴ پونڈ کا کاغذ ایک دستہ چھ پیسے کا ملتا تھا، ایک دھیلے کی چاٹ اتنی ملتی کہ میں کئی لڑکوں سے یارانہ کرلیتا تھا۔

مجھے رہ رہ کر وہ زمانہ یاد آتا ہے اور یاد آتا رہے گا، جب بدنیت انگریز یہاں راج کرتا تھا، لیکن یہ زمانہ بھی یاد رہے گا جس زمانے میں ہمارا دیش ہمارے اپنے نیک نیت نیتاؤں کی مٹھی میں ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ؕ

اللہ والے

بدلے کا دن تو حقیقتاً آخرت کا دن ہے لیکن کبھی کبھی عبرت کے طور پر اللہ تعالےٰ اچھے اور بُرے لوگوں کو اُن کی نیکی اور بدی کا کچھ صلہ اور بدلہ اس دنیا میں بھی دے دیتا ہے۔

"اللہ والے" بزرگ کا واقعہ میرے ایک رفیق نے مجھ کو سنایا۔ فرمایا کہ ان کا نام بتانے کی ضرورت نہیں، ساتھیوں میں عام طور پر اسی نام سے مشہور رہیں۔

میرے رفیق نے بتایا کہ اللہ والے صاحب محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور اسلامیہ اسکول کے سپروائزر رہ چکے ہیں۔ متقی اور پرہیزگار آدمی ہیں۔ حضرت شیخ...... رحمتہ اللہ علیہ کے مُرید ہیں۔

اللہ والے صاحب جس گاؤں کے رہنے والے ہیں، وہ گاؤں ہے تو ضلع بستی میں لیکن وہ گورکھپور کے ایک غیر مسلم شخص کی زمینداری میں رہ چکا ہے زمینداروں کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ چاہے مسلم ہوں یا غیر مسلم، انکی اکثریت نہایت مغرور اور خوشامد پسند ہوتی ہے (یا اب یوں کہنا چاہیے کہ ہوتی تھی۔)

اللہ والے با اُصول اور دیندار ہونے کی وجہ سے زمیندار کے ساتھ بڑی خودداری سے پیش آتے تھے، اس لیے زمیندار اُن سے ناخوش رہتا تھا۔ اور انہیں نقصان

پہچانے کی فکریں کیا کرتا تھا لیکن اللہ کے فضل سے اللہ والے صاحب کو کوئی زک نہ پہنچا سکا۔

اب سنیے، ۱۹۴۷ء کے بعد تنسیخ زمینداری کا قانون لاگو ہوا تو زمیندار صاحب کی ساری زمین ہاتھ سے نکل گئی۔ لے دے کے اُن کے پاس ایک کوٹھی معہ باغ اور اُس کے آس پاس کا ایک وسیع وعریض پلاٹ جو غالباً خود کاشت کے طور پر تھا، رہ گیا۔ تنسیخ زمینداری کے کچھ دنوں بعد زمیندار کا انتقال ہو گیا اس کی جگہ اس کی بیوہ نے لی۔ بیوہ کو کوٹھی، باغ اور پلاٹ کا مالک دیکھ کر گاؤں کے ہندو مسلم سارے لوگوں نے مشورہ کیا کہ ان چیزوں پر بھی زبردستی قبضہ کر کے آپس میں بانٹ لینا چاہیے، مالکن عورت ذات ہے، اور پھر کوسوں دور گورکھپور میں بیٹھی ہے، کر ہی کیا سکے گی۔

گاؤں کے تمام ہندو اور مسلم سب نے یہ طے کر کے عملی جامہ بھی پہنانا شروع کر دیا۔ بڑھ بڑھ کر پلاٹ جوتنا اور بونا شروع کر دیا۔ یہ خبر زمیندار کی بیوہ کو ہوئی، اس نے اپنے مختار کو بھیجا۔ مختار نے صورتِ حال دیکھی۔ سارے گاؤں کو متحد دیکھ کر وہ بھی گھبرایا۔ اس سے اور کچھ بن نہ پڑا تو گاؤں والوں کے خلاف درخواست دے دی اور سرکار کی طرف سے تحقیقات آ گئی۔

تحقیقات کے وقت گاؤں کا ایک آدمی بھی مختار کو گواہی کے لیے نہ مل سکا۔ اس نے کہا کہ یہاں کے مسلمانوں کو قرآن اور ہندوؤں کو گنگا جل اٹھانا ہوگا۔

گاؤں کے ہندو مسلمان سب حلف اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب مختار صاحب کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ خدا کی قدرت کہ اسی وقت اللہ والے صاحب ایک طرف کو جاتے ہوئے نظر آئے ان کو دیکھ کر مختار صاحب

نے کہا کہ اگر یہ بزرگ کہہ دیں کہ یہ زمین گاؤں والوں کی ہے تو ہم دستبردار ہو جائینگے
یہ کہہ کر مختار صاحب خود دوڑ کر اُن کو بلا لائے گاؤں والوں کا خیال تھا کہ اللہ والے
صاحب کی زمیندار سے کبھی بنی نہیں ہمیشہ دونوں طرف تناؤ رہا، اس لیے وہ بھی
ہماری جیسی کہیں گے اور پھر یہ کہ تن تنہا وہ گاؤں والوں کی خفگی کیوں مول لینے
لگے۔ یہ سوچ کر گاؤں والے بھی راضی ہو گئے۔ اللہ والے صاحب آئے، اُن سے
پوچھا گیا۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ گاؤں والے سب جھوٹے ہیں۔ یہ
باغ، یہ کوٹھی اور یہ پلاٹ زمیندار کی خود کاشت زمین میں ہمیشہ رہا ہے۔ اُس کے
بعد انہوں نے گاؤں والوں کے جھوٹ اور اُن کی اسکیم کا پول بھی کھول دیا۔

اللہ والے صاحب کے حلفیہ بیان پر زمیندار کی بیوہ کا قبضہ بحال رہا۔
بیوہ نے سوچا کہ گاؤں والوں کی مخالفت کی وجہ سے اس جائداد سے فائدہ اٹھانا
محال اور ناممکن ہے۔ اس لیے اسے فروخت کر دینا چاہیے۔

اُس ہندو بیوہ نے اللہ والے صاحب کو بلایا اور کہا "یہ باغ، یہ کوٹھی اور
یہ پلاٹ آپ خرید لیں۔" اللہ والے صاحب کے پاس اتنا پیسہ کہاں تھا کہ اتنی بڑی
مالیت کی جائداد خرید سکتے۔ انہوں نے کہا "میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ میں
اسے خرید سکوں۔" بیوہ زمیندار نے پوچھا۔

"کتنی رقم آپ فراہم کر سکتے ہیں؟" جواب دیا۔ "زیادہ سے زیادہ چار
پانچ ہزار۔"

"بس اتنی رقم بہت ہے۔" اس ہندو بیوہ نے کہا، اور رجسٹری کرنے کو
تیار ہو گئی۔ یہ خبر گاؤں والوں کو ہوئی تو ایک ہندو کاشتکار جو ندکورہ جائداد کو ہڑپ
کر لینے کے سلسلہ میں پیش پیش تھا، بیوہ کے پاس پہنچا، اور پندرہ ہزار کی رقم
پیش کی، اور اشارہ کیا کہ کچھ اور بڑھایا جا سکتا ہے لیکن بیوہ زمیندار نے منظور

نہ کیا۔ اُس نے جواب دیا:۔

"تم لوگ اگر لاکھوں بھی دو تو تم کو اپنی جائداد نہ دوں گی اور اللہ والوں کو پانچ پیسوں پر دے دوں گی۔"

ہندو کاشتکار اپنا۔ امنہ لے کر واپس ہوا۔ اور ہندو بیوہ زمیندار نے وہ پلاٹ اور باغ وغیرہ سب اللہ والے کے نام کر دیا۔

میرے رفیق نے جب اللہ والے بزرگ کا قصہ مجھے سُنایا تو میں سوچنے لگا کہ بدلے کا دن حقیقتاً آخرت کا دن ہے لیکن کبھی کبھی عبرت کے طور پر اللہ تعالیٰ اچھے اور برے لوگوں کو اُن کی نیکی اور بدی کا کچھ صلہ اور بدلہ اس دنیا میں بھی دے دیتا ہے جیسے اللہ والے صاحب کو ان کی سچائی کا بدلا ملا۔

روپیہ ہوتا، یہ اطمینان کب ہوتا نصیب
سو رہے اور گھر کا دروازہ کھلا رہنے دیا

یو، پی میں ایک ریاست تھی، جہانگیر آباد۔ جہانگیر آباد لکھنؤ کے پاس ضلع بارہ بنکی میں ہے۔ ریاستوں کے مرج ہونے سے پہلے راجہ صاحب جہانگیر آباد معروف شخصیت تھے۔ انہیں شعر و سخن کا بڑا شوق تھا۔ ان کے ایک درباری شاعر تھے فضا صاحب بسوانی۔ فضا صاحب، جگر صاحب بسوانی (شاگرد منشی امیر احمد مینائی ؒ) کے چھوٹے بھائی تھے۔ ایک بار راجہ صاحب ان دونوں بھائیوں کا کلام سُن کر بہت محظوظ ہوئے، اور خلعت کے ساتھ ایک ایک ہزار روپیہ نقد بھی دیا۔

دونوں بھائی خلعت اور روپیہ لے کر واپس ہوئے۔ اسٹیشن پر آئے، ٹرین میں بیٹھے سکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ ڈبے میں اُن کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ دونوں پاؤں پھیلا کر بے کھٹکے سو رہے، دیر تک سوتے رہے، لکھنؤ کے قریب جگر صاحب جاگے۔ دیکھا تو فضا صاحب فکرِ سخن فرما رہے تھے۔ جگر صاحب کو جاگتا دیکھا تو فضا صاحب بولے :-

"بھائی صاحب! ملاحظہ ہو، کیا خوب شعر کہا ہے!!"

جگر صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے، اِدھر اُدھر دیکھا، ہینڈ بیگ کا کہیں پتہ نہ تھا، اُسی میں روپیہ رکھا ہوا تھا۔ فضا صاحب سے پوچھا "ہینڈ بیگ کہاں ہے؟" اور پھر یہ جان کر کہ کوئی اڑا لے گیا۔ فرمایا۔ "روپیہ پاس ہو تو یوں بے خبر نہیں سونا چاہیے تھا"

جگر صاحب یہ کہہ چکے تو فضا صاحب نے شعر سُنایا ؎

روپیہ ہوتا، یہ اطمینان کب ہوتا نصیب

سو رہے اور گھر کا دروازہ کھلا رہنے دیا

جگر صاحب نے یہ واقعہ خود مجھ سے بیان کیا۔ یہ واقعہ سُن کر مجھے کچھ ایسے سرمایہ دار یاد آ گئے جن کو میں نے خود دیکھا ہے، انہیں اچھی طرح جانتا ہوں بیچارے اس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں، گویا زندگی انہیں بسر کر رہی ہے۔ وہ سوتے ہیں تو گہری نیند سو نہیں پاتے۔ بار بار چونک پڑتے ہیں، سوتے میں بڑبڑاتے ہیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں سے ہر وقت خوفزدہ رہتے ہیں۔

میری نظر میں ایک بہت بڑا تاجر ہے۔ اس "غریب" کے یہاں "دساور" سے جب مال آتا ہے تو بلٹی ہاتھ میں آتے ہی اسے دست آنا شروع ہوتے ہیں آپ سمجھے کیوں؟ اس لیے کہ بیچارہ پورے مال پر بلیک نہ کر سکے گا۔ مال کا ایک بڑا حصہ "پرمٹ" والوں کو دینا ہی پڑے گا۔ نیز یہ کہ جتنے مال پر اُسے بلیک کرنا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اُسے "پار" کرنے میں پھنس جائے۔ بس لالچ اور خوف سے ایک عجیب کرب میں ہر وقت مبتلا رہتا ہے۔

میں ایک اور سرمایہ دار کو جانتا ہوں جو سو نہیں سکتا، اسے نیند نہیں آتی وہ خواب آور گولیاں کھاتا ہے۔ ایک اور سرمایہ دار میرا رشتہ دار ہے۔ وہ نہ کھا سکتا ہے، نہ پہن سکتا ہے مگر جمع کرنے کا بے حد حریص ہے۔ بازار میں سستی

سے سستی ترکاری خریدتے روزانہ لوگ اسے دیکھتے ہیں۔

دوسری طرف ان غریبوں کو دیکھتا ہوں جن کے چھپر پر پھونس بھی نہیں، وہ گھر بھر بڑے آرام، چین اور اطمینان سے سوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فضا صاحب نے جو شعر نظم فرمایا اس میں فن شعر سے زیادہ حقیقت ہے، اور شاید اسی وجہ سے مجھے اب تک یاد ہے، پھر سنیے۔ ؎

روپیہ ہوتا، یہ اطمینان کب ہوتا نصیب
سو رہے اور گھر کا دروازہ کھلا رہنے دیا

یہ واقعہ میرے ایک رفیق نے مجھ سے بیان کیا اور میں نے اسے
اپنے مخصوص انداز میں اس طرح لکھا۔

"بہن! یہ سب آپ ہی کے بچے ہیں؟"
"ہاں بہن! اللہ انھیں جیتا رکھے، یہ سب میرے ہی بچے ہیں!"
"ماشاء اللہ، بڑے پیارے بچے ہیں۔ میں کچھ اور......"
"کیا، آپ کیا سمجھی تھیں؟"
"ان بچوں پر آپ کا پیار دیکھ کر پہلے تو میں یہی سمجھی کہ آپ ہی کے ہیں لیکن
ان چار سے وہ تین بچے نہیں ملتے، اسی لیے پوچھا میں نے۔"
"اچھا یہ بات ہے!"
"ایک بات اور ہے۔"
"وہ کیا؟"
"وہ یہ کہ آپ کی رضیہ کو چھوڑ کر باقی سب بچے قریب برابر ہی ہیں،
یہ کیا بات ہے؟ جڑواں بھی نہیں معلوم ہوتے۔"
"اے بہن! شاید تم بات پا گئیں، لیکن میں بچوں کے سامنے یہ نہیں

کہہ سکتی کہ یہ میرے نہیں ہیں۔"

"تو کیا سچ مچ وہ تین بچے آپ کے نہیں؟"

"بیٹی رضیہ! ذرا منے کو باہر ٹہلا لاؤ، بڑی دیر سے میری گود میں پڑا ہے اور دیکھو ان سب کو بھی ساتھ لیتی جاؤ۔"

"ہاں بہن! بچوں کے سامنے میں بتانا نہیں چاہتی تھی، اب بتاتی ہوں، ان میں چار بچے "میرے" ہیں اور تین میری سوکن کے۔"

"سوکن کے!؟"

"ہاں، میری پیاری سوکن کے!"

"پیاری سوکن!؟"

"ہاں پیاری سوکن کے۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ چین نصیب کرے۔"

"بہن! آپ بڑی نیک ہیں۔"

"نہیں، میں نہیں، میری سوکن کو آپ دیکھتیں، تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اللہ کی نیک بندیاں کیسی ہوتی ہیں۔"

"ہاں بہن! ٹھیک ہے، دنیا جتنا چھانو اتنا جانو، آپ کی سوکن کے بارے میں تو آپ سے سن رہی ہوں، آپ کو دیکھ رہی ہوں۔"

"انہیں دیکھتیں!"

"تو سناؤ کچھ ان کا حال، مجھے تو یہ بات بڑی انوکھی اور نرالی لگ رہی ہے"

"ہاں آج کل تو عجیب اور انوکھی ہی ہے۔ آج کل ہے کون، جو ایسا کرے؟ اللہ کی ایک سے ایک نیک بندیاں پڑی ہیں لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتیں جیسا میری سوکن نے کیا۔"

"کیا کیا انہوں نے؟ بات اب لمبی نہ کیجیے، بس کہہ چلیے!"

"سنیے، یوپی میں ہردوئی ایک مقام ہے، وہاں ایک خورشید صاحب تھے، اللہ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے، بڑے سیدھے اور نیک انسان تھے، ماموں زاد بہن سے ان کی شادی ہوئی گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ سو بیگھہ خود کاشت زمین، ایک بڑا سا پکا مکان، چار جوڑی عمدہ بیل، اُن کے لیے ایک بڑا سا احاطہ، دو، راسی بھینسیں، تین مستقل ہل واہے۔ اپنے ہلواہوں کو خورشید صاحب نے الگ سے دس دس بیگھہ زمین خرید وادی تھی۔ ہلواہے اپنا کام سمجھ کر سارا کام کرتے۔ اللہ نے رزق میں برکت بھی دی تھی۔ خوب پیدا ہوتا۔ خورشید صاحب اور ان کی بیوی چین سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس طرح ایک مدت ہوگئی لیکن ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس بات سے میاں بیوی کچھ اُداس سے رہنے لگے۔ زبان سے نہ میاں، بیوی سے کچھ کہتے، نہ بیوی میاں سے۔ اللہ کے بھروسے پر صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کیے چلے جا رہے تھے۔ جب آٹھ نو برس یونہی گزر گئے تو دونوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر حکیموں اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ بیوی بانجھ نکلیں...."

"بانجھ! سب اللہ کی قدرت ہے۔"

"ہاں بہن! اللہ کی قدرت ہے، جسے جو چاہے دے۔ کوئی روکنے والا نہیں۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ دونوں مایوس ہو گئے۔"

"اور عمر کیا ہوگی؟"

"لگ بھگ ۳۵ اور ۴۰ سال کی۔"

"مگر بہن! خورشید صاحب تھے بڑے اچھے۔ دوسری شادی کی طرف

"ہاں بہن! یہ تو ہے، اسے چھوڑو، خورشید صاحب کا قصہ سناؤ۔"

"ہاں تو جب وہ اپنا گھر بار دیکھتے تو آئندہ کے لیے اس کے وارث کا دھیان ضرور آتا۔ اور بہن! اچھی بات یہ ہے کہ جب خورشید صاحب چالیس کے قریب ہوئے تو دونوں کی زبان پر دل کی بات آنے بھی لگی۔ پاس پڑوس کے بچوں کو دیکھتے تو، دیکھتے رہ جاتے۔ ایک دن بیوی نے ایک بچے کو روتے دیکھا۔ حال پوچھا تو معلوم ہوا، سوتیلی ماں ہے، اس نے مارا بھی اور گھر سے نکال دیا۔ وہ بچے کو لے کر اس کے گھر گئیں۔ سوتیلی ماں کو سمجھایا، بجھایا۔ واپس ہوئیں تو گھر میں میاں کو اکیلا بیٹھے پایا۔ پہلے پڑوس کے بچے کا حال سنایا۔ پھر میاں کی خیریت پوچھی۔ خیریت پوچھنے پر میاں کی زبان سے بے اختیاری میں نکل گیا۔ "اب تو یہ بھرا پُرا گھر سنسان نظر آتا ہے۔"

بیوی خدا جانے ایک بچے کی سوتیلی ماں سے جو باتیں کر کے آئی تھیں، ان کا اثر تھا ہی، میاں سے یہ جملہ سنا تو تڑپ گئیں۔ کچھ سوچ کر بولیں:۔

"میں کچھ ایسا سوچتی ہوں کہ کیا کہتے ہیں، میں آپ سے کہتی ہوں، کہ کیا وہ جو بات ہے نا!" بے چاری کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر ہکلا کر رہ گئیں دل کی بات کہہ نہ سکیں۔ میاں نے پوچھا "کیا کہنا چاہتی ہو بھئی؟" جرأت کر کے آخر کہہ ہی دیا۔

"میں سوچتی ہوں ایک بیاہ اور کر لو۔"

"بیاہ!" میاں کی زبان سے نکلا، اور ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا لیکن بیوی ایک ارادہ کر چکی تھیں۔ انہوں نے پھر کہا، پھر کہا۔ آج کہا، کل کہا، اور پھر اتنی بار کہا کہ میاں بھی انہی کی طرح سوچنے لگے، ان ہی کی طرح سوچنے لگے تو پھر اس نیک بیوی نے لڑکی ڈھونڈنا شروع کی۔ دو ایک جگہ پیغام بھجوایا۔ لوگ حیرت میں رہ گئے انکار ہوگیا۔ پھر خود کھوج میں نکلیں۔ جس گھر میں منہ کھولا ہنسی گئیں، بنائی گئیں لیکن پھر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بیوی اپنے میاں کا سچ مچ بیاہ کرنا چاہتی ہیں۔ پھر تو سنجیدگی

سے لوگوں نے سوچنا شروع کیا۔ اس وقت میں بیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ میرے لیے پیغامات آتے، مگر ایسے کہ ابا کو غصہ آتا اور اماں کڑھ کر رہ جاتیں۔ خورشید صاحب کی بیگم صاحبہ ایک دن میرے گھر جا دھمکیں اور کچھ اس طرح سے اماں سے بات کی کہ وہ راضی ہو گئیں۔ وہ راضی ہو گئیں تو ابا بھی تیار ہو گئے اور میں؟

بہن! سچ کہتی ہوں، مجھے سوت پر جانا بالکل پسند نہ تھا۔ سوت کے قصے کہانیاں سن چکی تھی۔ میں ڈر بھی رہی تھی اور مجھے غم و غصہ بھی تھا۔ اگر میرا بس چلتا تو انکار کر دیتی، یہ عورت ذات آپ جانتی ہیں بے بس ہوتی ہے۔ جس کا ہاتھ چاہو پکڑا دو۔ اور اس طرح کے خیالات میرے دل میں تھے جب میں دلہن بن کے خورشید صاحب کے گھر پہنچی۔ خیر وہ وقت تو بیت گیا۔ اس کے بعد میں وہاں پہنچی تو جیسے ہی جا کر بیٹھی، میری سوکن نے کنجیوں کا گچھا مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! لو یہ کنجیاں، وہ دیکھو ہے تجوری، یہ دیکھو ہیں بکس، وہ ادھر ہے سامان غلہ، اور یہ اور وہ، یہ سب تمہارا ہے اور میں، اگر مجھے کچھ سمجھنا تو سمجھنا، ورنہ سمجھنا کہ ایک نوکرانی پڑی ہے۔"

یہ کہہ کر گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ بار بار میرے پاس آتیں ہنس کر کہتیں بٹیا! آرام سے بیٹھو، لو یہ کھاؤ، تھوڑی دیر لیٹ جاؤ نا! اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو، کسی چیز کی ضرورت ہو تو نوکر سے منگوا دوں۔"

میں نے پہلے یہ باتیں سنیں تو ظاہری لگتو پتو سمجھی، لیکن روز روز جب یہ خاطریں دیکھیں تو میرے دل نے کہا "یہ سچ کہتی ہیں۔" اور پھر میں کچھ کچھ ان سے بولنے لگی، اور پھر مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ مجھے اپنے گھر کیوں بیاہ لائیں۔ کچھ دن کے بعد ذرا بے تکلف ہوئی تو میں بھی کام دھندہ دیکھنے لگی، تو جیسے میری امی مجھے پیار بھرے بولوں میں ڈانٹتی تھیں، اسی طرح انہوں نے مجھے ڈانٹا، میں نہ مانی تو

ہاتھ پکڑ کر میرے کمرے میں لے گئیں اور مسکرا کر بولیں، "قید کر دوں گی اسی کمرے میں"۔
تھوڑے ہی دنوں میں ان سے میری وحشت دُور ہو گئی۔ بلکہ مجھے ان سے محبت ہونے لگی۔ پھر بتاؤں، اللہ کی مہربانی ایسی ہوئی کہ سال کے اندر ہی خورشید صاحب کا ارمان پورا ہوا، اللہ نے میری گود بھری، یہ رضیہ پیدا ہوئی تو ادھر دیکھو سنو تو دھیان سے میری سوکن نے کیا کیا؟ بس پہلے ہی دن سے رضیہ کو مجھ سے چھین لیا اور کہا، "بس! یہ میری بیٹی ہے تم بس دودھ پلا۔ نے بھر کی ہو"۔ اس کے بعد رضیہ کو سلانا، کھلانا، پلانا، نہلانا، دھلانا، دیکھ بھال سب کچھ اپنے ذمے لے لیا۔ میں اب بھی رانی بنی گھر میں راج کرتی۔

اور سنیے، خدا کی قدرت خدا ہی جانے۔ میں بتا چکی ہوں، ڈاکٹروں اور حکیموں نے میری سوکن، میں انہیں سوکن کہوں کہ ماں۔ خیر سنو! ڈاکٹروں نے میری سوکن کو بانجھ بتا یا تھا۔ نہ جانے رضیہ پر میری سوکن کا پیار تھا یا میرے شوہر نے میری سوکن کی یہ خدمت دیکھی تو ان کا گہرا پیار، یا پھر اللہ کا فضل سمجھیے، وہ جب جو چاہے کرے۔ دوسرے سال جب میرا "رشاد" پیدا ہوا تو اس کے تیسرے مہینے میری سوکن کے بھی بچہ ہوا، اور پھر میرے اُن کے کچھ ہی دنوں کے فرق سے اولادیں ہونے لگیں۔ چار میرے ہوئیں اور تین ان کے۔ لیکن ان ساتوں بچوں کی ماں جو پوچھو وہی تھیں۔ مجھ سے کچھ تعلق نہ تھا۔ یہ ساتوں بچے انہی کو اپنی ماں کہتے بھی تھے۔ میری سوکن نے بچوں سے مجھے ماں کے بدلے آپا جان کہلوایا۔ اس کے بعد اللہ کی مرضی۔ یہ مُنا ایک برس کا ہوا، تو خورشید صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے، اور ان کے چھ سات مہینے پیچھے وہ بھی چل بسیں۔

میں کیا بتاؤں، مرتے تو سبھی ہیں، اور مرنا بھی سب کو ہے، پر مجھے اپنی سوکن کی موت سے جو دکھ ہوا، وہ بیان نہیں کر سکتی۔ اب میری کوشش یہی ہے کہ

یہ ساتوں بچے آپس میں کچھ فرق نہ سمجھیں۔ اسی لیے میں نے آپ کے پوچھنے پر بچوں کو اس جگہ سے ہٹایا، تب یہ سب بتایا۔ آپ ہی بتائیے اگر آج ایسی ہی اللہ کی نیک بندیاں ہوں تو ہمارے یہاں لڑکیوں کا مسئلہ آپ سے آپ حل ہو جائے ہیں تو دن رات اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ جیسی میری سوکن تھیں ایسی ہی سبھی عورتیں ہوں۔"

کتوں کا باپ

(اس واقعہ میں تمہید میری طرف سے اضافہ ہے)

میں واقعی مذاق سمجھ رہا تھا، اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس نے اسی جگہ چیک میرے ہاتھ میں تھما دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی میرے دیسی جھبرے کتوں پر نہ جانے کیوں ریجھ گیا تھا۔ دو ہزار میں تو جرمنی نسل کے کئی بہترین جوڑے مل سکتے تھے۔ میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"آپ دیکھتے کیا ہیں؟ دو ہزار کا چیک آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ یہ کتے میرے ہاتھ بیچ چکے، اب یہ میرے ہیں۔" اس نے کہا اور زنجیر میرے ہاتھ سے لے لی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔ مجھے کتوں کے بک جانے کا رنج نہیں ہوا۔ ہاں دن بھر خیال ضرور آتا رہا، لیکن جب خیال آیا تو دو ہزار کے چیک نے مجھ کو مطمئن کر دیا۔ دل نے کہا۔

"اونہہ، گائے، بیل، بھینس، بکری، کتے، بلی تو وہ مخلوق ہیں کہ جب تک ہمارے ہیں، ہیں۔ بیچ دیا تو ہمارے کب رہے؟ وہ بیٹا بیٹی تو نہیں جن کے چلے جانے کا غم کیا جائے۔ پیسہ پاس ہونا چاہیے۔ ایسے بیسیوں مل جائیں گے۔ پھر یہ کہ دو ہزار کی رقم بھی تو اچھی خاصی رقم ہے!"

میں دن بھر اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہا۔ شام کو گھر لوٹا، کھا پی کر

رات گزاری۔ صبح کو جب ٹہلنے کے لیے پارک کی طرف چلا تو اس وقت واقعی کتوں کی یاد ستانے لگی اور اس وقت سمجھ میں آیا کہ اگر محبت کسی چیز کا نام ہے تو اس کی قیمت روپیہ پیسہ نہیں ہے' اس وقت اکیلے پارک جاتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں واقعی پارک نہیں گیا، لیکن گھر بھی واپس نہیں ہوا۔ میرے قدم آپ سے آپ بنرجی باغ کی طرف اُٹھ گئے۔ وہی بنرجی باغ جس کے مالک مسٹر ستیش چندر بنرجی نے کل مذاق ہی مذاق میں کتے خرید لیے تھے اور جس کے اندر بنی ہوئی کوٹھی میں وہ رہا کرتے تھے۔ ان کا پتہ میرے لیے آسان تھا۔ کل ہی تو ان کے چیک سے دو ہزار کی رقم وصول کی تھی۔ آدھ گھنٹے کے بعد میں بنرجی باغ کے پھاٹک پر لگا ہوا بورڈ پڑھ رہا تھا۔

میں نے دیکھا باغ کے اندر منھدی کی ٹٹیوں کے بیچ ایک خوبصورت کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ مسٹر ستیش چندر بنرجی ٹٹیوں کے پار صحن میں کرسی ڈالے کتوں کے بیچ بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید میرے دونوں رفیقوں نے میری بو سونگھ لی تھی۔ انہوں نے کان کھڑے کیے۔ بنرجی نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں۔

"آئیے آئیے، تشریف لائیے!" وہ مسکراتے ہوئے اٹھے۔ میری طرف بڑھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ لے جا کر محبت سے بٹھایا۔ میرے دونوں پرانے رفیق، جواب میرے نہیں تھے، بے تابانہ کوں کوں کرکے دوڑے اور بڑی گرمجوشی سے ملے۔ وہ دُم ہلاتے ہوئے آئے' اپنے دونوں اگلے پاؤں اٹھا کر میرے کندھوں پر رکھے۔ میرے چہرے کے سامنے اپنا منھ کرکے گویا یہ کہا۔ "مالک! ہم تمہیں بھولے نہیں۔ تمہارا شکریہ! کہ ہمیں دیکھنے آئے۔" اس کے بعد میرے سامنے لوٹنے لگے۔ میں نے بھی ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا، پیار کیا۔ بنرجی بولے۔ "آخر ان کی یاد آپ کو

کھینچ ہی لائی۔ محبت بھی عجیب چیز ہے !" اس کے بعد کہنے لگے "آپ اس وقت ناشتہ میرے ساتھ کریں گے۔"

کس ٹھاٹ سے ناشتہ ہوا؟ میں نے بنرجی کی کوٹھی کو کیسا سجا سجایا پایا؟ کیا کیا عیش کا سامان اُن کے یہاں نظر آیا، کتنے کتے تھے ان کے یہاں؟ ان پر کیا خرچ ہوتا ہوگا؟ ان سارے سوالوں کے جواب ہیں، میں بلا تامل بنرجی کو نواب کہہ سکتا ہوں لیکن میں ان سوالوں کے جوابات میں نہ الجھوں گا میں تو صرف ایک بات عرض کروں گا۔ وہ بات، جس کا انکشاف میرے ایک سوال کے جواب میں بنرجی نے کیا۔

اصل میں باغ کی شان وشوکت اور نوابی ٹھاٹ دیکھ کر میرے دل میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ بنرجی صاحب جائداد ہونے کے ساتھ شاید کئی ایسے بچوں کے باپ ہیں جو غالباً پڑھ لکھ کر فارغ ہو چکے ہیں۔ اور اب ایسے عہدوں پر فائز ہیں جہاں آمدنی کا کوئی غیبی دریا اُن کے قدموں کے نیچے بہتا ہوگا اسی لیے تو دو تین درجن کتوں پر بے دردی سے خرچ ہو رہا ہے۔ ورنہ تاجر پیشہ ہوتے تو تاجر پیشہ کا ذہن؟ جیسا ہوتا ہے سب جانتے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، میں نے پوچھا:

"بنرجی! صاحبزادگان کس سروس میں ہیں؟"

"صاحبزادے، یعنی میرے بیٹے، میری اولاد؟!" وہ اس طرح اُداس ہو گئے جیسے چھوئی موئی کو کسی نے چھو لیا ہو۔

"بھائی! میرے بیٹے اب کہاں؟ میری آل اولاد اب یہی کتے ہیں، میں تو اب ان کتوں کا باپ ہوں، اب میں اسی قابل رہ گیا ہوں کہ ان کتوں ہی سے اولاد کا حظ حاصل کروں۔" بنرجی لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ ان کے گرم گرم سانس صاف پتہ دے رہے تھے کہ وہ اس وقت کس اضطرابی کیفیت سے دوچار ہیں، انہوں نے

ایک نوکر کو بلایا۔ کتوں کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا:۔
"انہیں لے جاؤ۔" نوکر کتوں کو لے گیا۔ اب میں نے کہا:۔
"کیا واقعی آپ کی کوئی اولاد نہیں؟"
"نہیں بھائی! کہہ تو دیا۔" بنرجی کی بوڑھی اور ویران آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"اور آپ نے یہ کیا فرمایا کہ اب کتوں ہی سے اولاد کا حظ حاصل کر رہے ہیں؟"
میرے اس سوال پر بنرجی بولے۔ "کیا آپ کے پاس وقت ہے؟ اتنا وقت کہ میں کچھ کہوں اور آپ اطمینان سے سُن سکیں؟"
"میرے پاس ابھی ایک گھنٹہ ہے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
"بہت ہے ایک گھنٹہ" بنرجی نے جواب دیا۔ اور پھر وہ اس طرح اپنی رام کہانی سنانے لگے:۔

"میرے بھائی! میں آئی، سی، ایس گریڈ کا آدمی تھا۔ برسوں مختلف اضلاع میں کلکٹری کے فرائض انجام دے چکا ہوں۔ میں نے اپنی کلکٹری کے عہد زریں میں "خاندانی منصوبہ بندی" (فیملی پلاننگ) کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ حکومت مجھ سے بے حد خوش رہی۔ میرے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی! بیٹے پڑھ لکھ کر فارغ ہو چکے تھے۔ ترقی کی منزلوں کو طے کرنے کے لیے انہیں کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف یہ بتا دینا کافی تھا کہ وہ کلکٹر ضلع شریمان ستیش چندر بنرجی کے سپتر ہیں اور بس۔ میرے بڑے لڑکے کملیش نے کلکتے میں دوا سازی کا کارخانہ کھول رکھا تھا اور اس سلسلے میں وہ اکثر امریکہ آیا جایا کرتا تھا۔ دوسرا لڑکا دنیش ایک بنک میں منیجری کا امیدوار تھا۔ میری پیاری بیٹی نرملا کی سگائی کلکتے کے مشہور سیٹھ جگدیش چند کے سپتر رمیش سے ہوئی تھی۔ رمیش انگلینڈ ریٹرن تھا، اور باپ کے بعد تنہا کروڑوں کی جائداد کا مالک ہونے والا تھا۔"

بنرجی نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ میری اور میری اولاد کی خوش بختی پر، نہ جانے کیسے کیسے لوگ رشک نہ کر رہے ہوں گے! میری عمر اُس وقت چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اب کیا ضرورت تھی کہ مزید اولاد کی تمنا کرتا؟ خاندانی منصوبہ بندی کا لٹریچر پڑھ چکا تھا۔ اس کے لٹریچر کی ایک کتاب کا یہ جملہ مجھے اب تک نہیں بھولا کہ ایک خوش نصیب اور ہونہار بیٹے کے بعد اگر دوسرا بدنصیب اور غبی پیدا ہو گیا تو وہ باپ کے لیے کس درجہ شرم اور بدنامی کا باعث ہو گا؟ یہ الفاظ پڑھ کر میں کانپ گیا۔ "مجھ جیسے نامور کے یہاں اگر ایسا لڑکا پیدا ہو گیا تو؟" میں نے مسز بنرجی سے کہا۔ اُن کو نہ جانے کس نے خاندانی منصوبہ بندی پر ایمان لانے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ وہ میرے کہنے سے پہلے راضی ہو گئیں۔ پھر........"

بنرجی ذرا دیر رُکے۔ میں سمجھ گیا کہ لفظ "پھر" کے بعد وہ کیا کہنے والے ہیں؟ اور آگے ان کی رام کہانی کیا ہے؟ اگر میں اس وقت کچھ نہ بھی بولتا تو وہ سُنائے بغیر نہ رہتے، لیکن میری زبان سے نکل گیا کہ "پھر آپ نے آپریشن........؟"

"جی ہاں!" بنرجی کہنے لگے کہ "پھر میں نے نہایت خوشی سے آپریشن کرا دیا۔ میری یہ پیش قدمی حکومت کی نظر میں بہت ہی مستحسن قرار پائی۔ سال کے ختم ہونے پر حکومت کی طرف سے خطاب پاتے ہوئے لوگوں میں ایک میں بھی تھا۔ دوستوں کے مبارک بادی کے تار میرے پاس آنے لگے۔ تاروں کا تانتا بندھا تھا کہ ایک تار امریکہ سے آن گرا۔ پڑھا تو میری نظر میں دنیا اُلٹ گئی۔ میرا ذہین اور ہونہار بیٹا کملیش کمار امریکہ میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں ہم لوگوں سے دُور، اتنی دُور، پرواز کر گیا جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔

میرے دوست! اس حادثے سے میری جو حالت ہوئی، وہ تو ہوئی۔

مسز بنرجی نیم پاگل ہوگئیں۔ اُن کے سینے سے ہر وقت ایک ہوک اٹھا کرتی تھی۔ میں انہیں تسلی دیتا۔ نرملا ہر وقت ان کی چھاتی سے لگی رہتی۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ ذرا سنبھلیں تو ایک دن مجھ سے کہا "دنیش کو اب میں اپنے پاس رکھوں گی۔ ہمارے پاس کیا کچھ کم ہے، وہ عمر بھر بیٹھ کر کھائے گا تو بھی "کبیر" کا خزانہ خالی نہ ہوگا۔"

میں مسز بنرجی کے خیالات سے متفق نہ تھا لیکن اس وقت ان کو دکھی دیکھ کر دنیش کو دکھی دیکھ کر اپنی ترقی اور شہرت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ عنقریب ایک بنک کا منیجر ہونے والا تھا۔ ماں نے اُسے بہت روکا مگر وہ لڑتا رہا کسی طرح پاؤں توڑ کر گھر پر رہنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ مسز بنرجی کو نہ جانے کس گیانی نے یقین دلایا تھا کہ دنیش اگر گھر سے گیا تو پھر واپس نہ آ سکے گا۔ "موت" جس کا ہمیں کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ اب ہر وقت اپنے سروں پر نہیں، اپنی اولاد کے سروں منڈلاتی نظر آ رہی تھی کسی مہا پرش کی کہاوت ہر وقت دھیان میں رہنے لگی کہ "ایک بیٹا، بیٹیوں میں کوئی بیٹا نہیں۔" نہ جانے کب موت اُسے آ دبوچے اور اسی پر خاندان کا نام ہی مٹ جائے۔ اب ہم ہر وقت اپنی زندگی کے لیے نہیں، نیش کی زندگی کے لیے بھگوان سے پرارتھنا کر رہے تھے۔"

"گویا اب خدا یاد آیا" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں اپنی بے قابو زبان کو دل ہی دل میں کوسنے لگا۔ میرا یہ فقرہ بنرجی نے اچھی طرح سن لیا تھا کہنے لگے:۔

"میرے بھائی! آپ نے کیا کہا؟ ہاں واقعی اب مجھے بھگوان یاد آ رہا تھا اور زیادہ پاپ بھی۔ . . . ." بنرجی کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ نہ جانے دنیا کے کتنے نشیب و فراز دیکھ چکے تھے پھر بھی ان سے ضبط نہ ہو سکا وہ بچوں کی طرح

بلک کر رو دیئے ییں بھی بے حد متاثر تھا اور بار بار میری زبان سے "اُف، اُف" نکل رہا تھا۔ سمجھ تو میں گیا ہی تھا کہ آگے بنرجی پر کیا بیتا پڑی ؛ لیکن میں اُن کی یہ دُکھ بھری کہانی انہی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا :-

"پھر کیا ہوا؟"

" وہی جو ہونا تھا"، بنرجی نے جواب دیا۔ "وہی جو ہمارے بھاگیہ میں لکھا تھا۔ ذنیش ماں کو روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ اور پھر..... اور پھر... اس کے بعد ...... اس کے بعد ....؟" بنرجی کے منھ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سوت پھر پھوٹ پڑے۔ انھوں نے رو رو کر بتایا کہ دو تین مہینوں کے بعد ذنیش کو کینسر ہو گیا۔ اسے علاج کے لیے بمبئی لے جایا گیا۔ وہاں اس کے تمام دانت نکال دیئے گئے۔ لیکن مرض میں افاقہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ زبان کاٹنے کی نوبت آگئی۔ اُف .... فوہ !"

بنرجی نے ایک آہ کھینچی، پھر کہنے لگے:- "ہم نے جو پاپ کیا تھا، بھگوان اس کی سزا دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پوری سزا دی۔ ذنیش کسی طرح جانبر نہ ہو سکا اور اپنے بھائی کے پاس چلا گیا۔

بمبئی میں ذنیش کے ساتھ مسز بنرجی اور ان کے ساتھ نرملا تھی۔ میرا ایک پاؤں ضلع میں اور دوسرا بمبئی میں تھا۔ ہم نے سمندر کے کنارے ایک کوٹھی کرائے پر لی تھی لیکن ہزاروں خرچ کرنے کے بعد روتے ہوئے واپس ہوئے۔ واپس آنے کے بعد نرملا کو بخار رہنے لگا۔ ایک دن نرملا کے منھ سے خون گرا۔ اب ڈاکٹر رضوی کو دکھایا گیا۔ انھوں نے معائنہ لیا۔ ایکسرے ہوا۔ تھوک کی جانچ ہوئی۔ رپورٹ ملی کہ نرملا کا داہنا پھیپھڑا "فل" ہے۔"

"یعنی ٹی۔ بی ؟" بے ساختہ میں پوچھ بیٹھا۔ بنرجی نے کہا۔ "جی ہاں! نرملا کو دِق ہوگئی۔ اب میری کہانی ختم ہو رہی ہے۔ نرملا پورے تین برس بیمار رہ کر اپنے بھائیوں سے جا ملی۔ میں نے قبل از وقت پنشن لے لی۔ مسز بنرجی بالکل پاگل ہو چکی تھیں میری شدید بندش کے باوجود ایک دن وہ نکل گئیں۔ تلاش کرنے پر تیسرے دن انکی لاش ایک تالاب میں تیرتی ہوئی ملی۔

اس کے کئی برس کے بعد میں ایک بار نینی تال گیا۔ وہاں ڈاکٹر رضوی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حال پوچھا۔ میں نے سارا حال کہا۔ پھر انہی کے مشوروں سے میں نے کتے پالنا اور اُن سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے میری دلچسپی کتوں سے اتنی بڑھ گئی کہ جہاں کہیں میں نے کوئی اچھا کتا دیکھا، زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خرید لیا۔ میرے ان کتوں میں ایک کتے کا نام کملیش ہے ایک کا نام دنیش ہے۔ اور وہ جو لال کتیا ناشتے کے وقت میری گود میں تھی، نرملا ہے۔ کملیش اور دنیش کو آپ ناشتے کی میز کے پاس چوکی پر دیکھ چکے ہیں۔

اب میں زیادہ کیا عرض کروں، یہی ہیں اب میرے بیٹے بیٹیاں اور میری اولاد۔" یہ کہہ کر بنرجی نے کہانی ختم کر دی۔ اور ہاتھوں کی کہنیاں میز پر ٹیک کر سر کو ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

کچھ دیر ٹھہر کر میں خاندانی منصوبہ بندی کے سب سے بڑے حامی "کتوں کے باپ" مسٹر ستیش چندر بنرجی ریٹائرڈ کلکٹر سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ راستے میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ آخر میں نے طے کیا کہ "کتوں کے باپ" کی یہ آپ بیتی دوسروں کو بھی سنا دوں، شاید کوئی اس سے عبرت حاصل کرے۔ اور پھر اندھا دُھند کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھے کہ پھر پشیمانی لاحق ہو اور کہتا پھرے:

ہائے خود کردہ را علاجے نیست"

پھول کی پتّی سے

بھیّن رام پور کا مشہور ڈاکو گزرا ہے۔ بھیّن کو دیکھنے والے اور اس کے حالات جاننے والے بہت سے اشخاص ہنوز حیات ہیں۔ مجھ سے ایک صاحب نے جو میرے دوست ہیں، بھیّن کا عجیب و غریب واقعہ سنایا۔ انھوں نے کہا:-

رام پور میں ایک متمول خاتون تھیں، وہ بوڑھی ہو چکی تھیں، شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بچی تھی جس کی شادی ہونا باقی تھی۔ اس بچی کی شادی طے ہوئی۔ شادی کی تیاریاں رام پور کی روایات کے مطابق دھوم دھام سے شروع ہوئیں۔ جہیز کا سامان تیار ہو چکا تھا۔ زیورات بن چکے تھے جو بحفاظت ایک بکس میں مقفل تھے۔

شادی کے دن آئے۔ لڑکی مائیوں بیٹھی، رت جگا شروع ہوا، پاس پڑوس کی لڑکیاں، لڑکی کا دل بہلانے کے لیے اس کے کمرے میں رہنے لگیں۔ اس شادی کی خبر بھیّن کو ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اچھا موقع ہے آسانی سے زیور اور روپیہ ہاتھ آ سکتا ہے۔ بھیّن نے بندوق کندھے پر رکھی، چلا۔ آدھی رات ہو چکی تھی، لڑکیاں ہنوز گا بجا رہی تھیں۔ بوڑھی ماں انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اور آئندہ انتظامات پر غور و خوض کر رہی تھی۔ گھر میں بوڑھی خاتون اور لڑکیوں کے علاوہ

کوئی اور نہ تھا۔

بھیتن دروازے پر پہنچا۔ اس نے کنڈی بجائی۔ اندر سے آواز آئی۔ کون صاحب؟ جواب دیا۔ "بھیتن" بھیتن کا لفظ رام پور کے خورد و کلاں کے لیے ایک بھیانک لفظ تھا۔ لڑکیوں نے سنا تو کانپنے لگیں بعض چھت پر چڑھ کر دوسرے مکانوں میں کود گئیں، جو رہ گئیں ان کے حواس بجا نہ رہے۔ کچھ بیہوش ہو گئیں، اور اُن کا برا حال ہو گیا۔

بوڑھی عورت نے دیر نہ کی۔ لڑکیوں سے کہا "گھبرانا مت۔" دل میں کچھ سوچ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ نہایت اطمینان سے کنڈی پر ہاتھ ڈالا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے بھیتن کندھے پر بندوق رکھے کھڑا تھا۔ جہاندیدہ بوڑھی عورت نے جیسے ہی بھیتن کو دیکھا آگے بڑھی اور بڑے پیار کے ساتھ کہا۔

"ارے بیٹا! تو اس وقت کیسے آگیا؟ اور ہاں تو اب کہاں تھا؟ اچھا آ! آتا کیوں نہیں؟" اور یہ کہہ کر بھیتن کا ہاتھ پکڑا۔ "ارے تو کیا سوچ رہا ہے؟ چل اندر۔ آج کچھ کھایا بھی کہ نہیں؟ اللہ تجھے جیتا رکھے، آج بچیوں نے بڑی اچھی کھیر پکائی ہے۔"

بوڑھی عورت یہ کہہ رہی تھی اور بھیتن کا حال یہ تھا کہ دم بخود کھڑا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

"تو اچھا تو ہے؟" اور یہ کہہ کر بوڑھی عورت بھیتن کو پکڑ کر اندر لے گئی، کنڈی پھر لگا دی۔ اس نے اسے ایک پلنگ پر بٹھایا۔ بھیتن پلنگ پر بیٹھ گیا، نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ عورت باورچی خانے کی طرف لپکی، کھیر کے ساتھ کچھ مٹھائی اور پھل لائی۔ بولی:۔

"بیٹا! تو ضرور بھوکا ہے۔ لے کچھ کھالے۔ ارے تو پہلے سے کیوں نہ آیا؟

تجھے روکنے والا کون ہو سکتا ہے؟ ہاں بیٹا! ننھی کے ابّا کے مرنے کے بعد سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اگر تو نے آنکھیں پھیر لیں تو کیا ہوا، کون کس کا ہوا ہے، بیٹا! اسی کا نام دنیا ہے۔"

بھیتن پر جادو اثر کر چکا تھا، وہ جذبات سے بھر چکا تھا، نہایت دھیمی آواز میں بولا:۔

"ماں! یہ میری بندوق رکھ دو" اور یہ کہہ کر اس نے دو تین چمچے کھیر کھائی۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ سب یہی سوچ رہی تھیں کہ دیکھیے اللہ کیا کرتا ہے بھیتن نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب پھر بوڑھی خاتون نے پیار کا ایک وار اور کیا:۔

"کیوں، کھاتا کیوں نہیں؟ دیکھو تو چہرے پر کیسی بے رونقی ہے، اور یہ مٹھائی اور پھل کس کے لیے چھوڑ دیئے؟"

"بس ماں! میں کھا چکا۔"

"کھا کیسے چکا، پکڑوں لکڑی؟ تجھے کھانا ہو گا ننھی، اری ننھی! دیکھ تیرا بھائی آیا ہے اور بے کھائے پیے جانا چاہتا ہے۔ آ! اپنے بھائی کو سلام کر!"

ننھی فاختہ بنی کمرے سے نکلی بھیتن کے سامنے آئی، جھکی، ماتھے پر ہاتھ رکھا، اور ماں سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اب بھیتن کی حالت یہ تھی کہ جیسے اسکے بدن میں جان ہی نہیں۔ وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دو ایک دانے مٹھائی کے کھائے اور بولا۔ "بس اماں! اب اجازت دیجیے۔ کل آؤں گا۔ علی الصباح۔"

اور یہ کہہ کر وہ اٹھا، بندوق لی، بچّی کے سر پر ہاتھ رکھا اور سلام کر کے چپکا چلا گیا۔ خاتون سجدے میں گر گئی۔

صبح کو پولیس کا خوف کیے بغیر بھیتن اپنی بہن کی طرف آیا۔ اس نے غسل کر کے صاف کپڑے پہنے تھے، شیروانی، ٹوپی، پاجامہ، جوتہ اس درجے سے پہنے ہوئے تھا، گویا وہ رام پور کا ایک رئیس اور مہذب آدمی ہو۔ وہ چھڑی ٹیکتا بے خوف جا رہا تھا سپاہیوں نے دیکھا۔ وہ خواہ مخواہ کیوں اُلجھتے۔ کترا گئے۔ اور دوسرے دیکھنے والے حیران تھے کہ یہ آج کیا انقلاب ہوا؟

اس کے بعد میرے دوست نے مجھے بتایا کہ پھر شادی کا سارا انتظام بھیتن نے اپنے سر لے لیا اور نہایت خوبصورتی سے وہ شادی ہوئی۔ ہزاروں کا جہیز بھیتن نے اپنے پاس سے دیا۔

میرے دوست یہ قصہ سنا کر چپ ہوئے تو میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟'' بولے۔ ''یہ تو ایک وقتی جذبہ اُبھرا تھا۔ پھر وہی بھیتن ویسے ہی ہو گئے جیسے تھے ایک دن کسی نے گولی مار دی۔''

میں نے یہ سُنا تو میں سوچنے لگا کہ آدمی چاہے کتنا برا ہو جائے لیکن اس کے اندر آدمیت بہر حال ہوتی ضرور ہے۔ ہاں اس کی آدمیت اس کے بہیمانہ افعال سے دب جاتی ہے۔ اگر اسے خوبصورت انداز میں ابھار دیا جائے اور اس کی تربیت کی جائے تو بُرے سے بُرا آدمی پھر اچھا آدمی بن سکتا ہے۔

ڈاکہ

میرے بچپن کا زیادہ حصہ میرے ننھیال میں گزرا ہے۔ بچپن میں میں اپنے نانا کے یہاں رہا کرتا تھا۔ میرے نانا بڑے دیانت دار آدمی تھے لوگ اپنا روپیہ زیورات وغیرہ بطور امانت اُن کے پاس رکھ دیتے اور جب انہیں ضرورت پڑتی لے جاتے تھے۔ میرے نانا اس مال کی پوری پوری حفاظت کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک بہت بڑی آہنی تجوری تھی۔ یہ تجوری ان کے سونے کے کمرے میں رکھی رہتی اور اسی کے اندر ساری امانتیں محفوظ ہوتی تھیں۔

ایک رات نانا جان نے خواب دیکھا جیسے ان کے ہاں ڈاکہ پڑا ہے اور ڈاکو تجوری کو توڑ کر ساری امانتیں لے گئے ہیں۔ صبح اٹھ کر انھوں نے گھر والوں سے اس کا خواب کا ذکر کیا، لیکن کسی نے کوئی توجہ نہ کی اور محض ایک خواب ہی تصور کیا۔

دوسری رات پھر یہ خواب دیکھا اور صبح اس کا ذکر کیا تو کوئی بھی اس کی تعبیر نہ بتا سکا۔ زیادہ سے زیادہ یہ خیال تو ظاہر کیا گیا کہ یہ خواب محض ایک واہمہ ہے۔ اور یہ واہمہ محض اس لیے پیدا ہوا ہے کہ تجوری میں بہت سے لوگوں کی امانتیں پڑی ہوئی ہیں جن کی حفاظت کا خیال نانا کے ذہن پر ایک خوف بن کر سوار ہوگیا ہے۔

تیسری رات بھی نانا کو یہی خواب نظر آیا۔ اس رات تو انہوں نے دو مرتبہ خواب میں ڈاکوؤں کو تجوری سے مال نکالتے دیکھا۔

خوف اس حد تک ان کے ذہن پر سوار ہوا کہ انہیں نیند نہ آسکی۔ وہ صبح تک جاگتے رہے۔ اذان ہوئی اور وہ مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے۔ نماز میں انھوں نے امام مسجد سے تینوں راتوں کے خوابوں کا ذکر کیا اور تعبیر پوچھی۔ امام مسجد بزرگ انسان تھے۔ انہوں نے چند لمحے غور کرنے کے بعد کہا کہ بہتر ہوگا کہ آپ ساری امانتوں کو لوٹا دیں اور اپنے پاس کچھ نہ رکھیں۔ کہیں یہ خواب درست ہی ثابت نہ ہو۔ مسجد سے واپس آکر نانا نے ان لوگوں کو بلایا جن کی امانتیں ان کے پاس تھیں۔ اور خواب کا ذکر کرتے ہوئے ہر شخص کو اس کی امانت واپس کردی۔

چوتھی رات نانا جان کو نیند نہیں آرہی تھی۔ ڈراؤنے خواب کا تاثر ابھی تک ان کے ذہن سے الجھا ہوا تھا۔ رات کے بارہ بجے مکان کی چھت پر کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ نانا اسی وقت گرم گرم لحاف سے باہر نکلے۔ کمرے کا دروازہ کھولکر صحن میں آئے، اور بڑی ہمت اور جرأت سے پکارا:۔

"کون ہے؟"

"ہم ہیں بابا!" ایک خوفناک آواز گونجی۔

"خون خرابہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ نیچے آجاؤ۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔" نانا نے جواب دیا۔ وہ ڈاکوؤں کو دیکھ چکے تھے دو ڈاکو بندوقیں تھامے نیچے اتر آئے اور ایک نے بندوق کی نال نانا کے سینے کی طرف کرتے ہوئے کہا:۔

"بوڑھے! ہمیں پتہ چلا ہے کہ تمہاری تجوری میں بہت سے لوگوں کا

روپیہ، سونا، چاندی پڑا ہوا ہے۔ ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ تجوری کی چابی ہمارے حوالے کر دو۔"

نانا نے اسی وقت تجوری کی چابی اُن کے حوالے کر دی، اور ڈاکو کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کی صورت دیکھ کر میں سہم گیا لیکن نانا کے چہرے پر کسی تشویش کے آثار نہیں تھے۔ ایک ڈاکو نے تجوری کھولی، اور یہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا کہ تجوری میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہیں ہے۔

"کہاں رکھا ہے مال تو نے بڈھے؟" ڈاکو بھڑک کر بولا، اور نانا نے بڑے اطمینان سے اپنے خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "میں ساری کی ساری امانتیں لوٹا چکا ہوں۔" میرا خیال تھا کہ اب ڈاکو نانا پر تشدد ضرور کریں گے۔ وہ نانا کے بیان پر کبھی یقین نہیں کریں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ دونوں ڈاکو مسکرائے "تم بالکل سچ کہتے ہو بوڑھے!"

ایک ڈاکو نے کہا، اور پھر اس نے بتایا کہ آج سے تین روز قبل تمہارے گھر پر ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ لیکن ہر رات ایک مقررہ جگہ پر جب ہم سب اکٹھے ہوتے تو کوئی نہ کوئی ساتھی پیچھے رہ جاتا اور وہ مقررہ جگہ پر نہ پہنچ سکتا۔ پہلی رات بھی یہی ہوا۔ دوسری رات بھی ہم سب اکٹھے نہ ہو سکے۔ اور تیسری رات بھی کوشش کرنے کے باوجود ہم ناکام رہے۔ ہمارے دو ساتھی دن بھر شراب نوشی کرتے رہے، رات کو وہ اس قدر دھت تھے کہ قدم بھی نہ اٹھا سکتے تھے لہٰذا تین رات تک ہمارا پروگرام ادھورا رہا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ حیران تھے کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ چوتھی رات ہم سب اکٹھے ہوئے اور یہاں آن پہنچے۔ ہمارے دوسرے ساتھی باہر کھڑے ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ تمہاری تجوری میں جن لوگوں کا

مال تھا وہ حلال کی کمائی تھی اور حلال کی کمائی کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ لیکن،

"ہم اس بستی سے خالی نہیں جائیں گے۔ کوئی گھر بتاؤ جہاں مال و زر رکھا ہو، ہم وہاں ڈاکہ ڈالیں گے۔" ڈاکو نے نانا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بستی سفید پوش لوگوں کی ہے۔ کسی کے پاس دولت کے انبار نہیں ہیں۔" نانا نے بستی کے بڑے گھروں کو ڈاکوؤں سے بچانے کی غرض سے کہا۔

"خالی تو ہم نہیں جائیں گے۔ بستی میں کوئی سنار تو ضرور ہوگا؟"

"بستی میں سنار کا گھر تو ہے، لیکن اس کے پاس اپنا سونا کہاں! وہ تو لوگوں سے سونا لے کر ان کی چیزیں تیار کر دیتا ہے۔"

"بہت اچھا، ہم کوئی گھر خود تلاش کریں گے۔"

یہ کہہ کر ایک ڈاکو دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، اور دوسرا ڈاکو بندوق تانے گھر ہی میں ٹھہرا رہا کہ ایسا نہ ہو کہ نانا شور مچا دیں۔

قریباً ایک گھنٹہ تک گھر میں قبرستان کی سی خاموشی رہی۔ اس کے بعد دوسرے ڈاکو آ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی اور وہ ان کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے نانا کی تجوری میں محنت کشوں اور مزدوروں کے خون پسینہ کی کمائی بطور امانت رکھی تھی یا زیورات کی شکل میں چند بیواؤں کی پونجی۔ میں آج محسوس کرتا ہوں کہ خدا حلال کی کمائی کی حفاظت کسی نہ کسی ذریعہ سے ضرور کرتا ہے۔ خواہ وہ ذریعہ خواب ہو، یا خواب کے روپ میں کوئی بشارت، یا کوئی اور ذریعہ۔

الاَعمَالُ بِالنِّیَّات

"خیریت ہے بھائی! یہ اسٹیشن پر پولیس فورس کیسی؟" میں نے ایک مسافر سے پوچھا اور حیرت اور گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پلیٹ فارم کی طرف دیکھنے لگا۔ مسافر نے بتایا کہ ایک نوجوان نے بہت بڑی قربانی پیش کی ایک عورت کا ڈیڑھ سال کا بچہ پلیٹ فارم سے پٹری پر گر گیا۔ ادھر سے طوفان آ رہا تھا۔ عورت دیوانہ وار کودنے والی تھی کہ ایک نوجوان نے بڑھ کر اُسے روکا اور خود کود پڑا۔ بچے کو اٹھا کر اس نے پلیٹ فارم پر پھینک دیا لیکن خود بچ نہ سکا۔ طوفان اپنی پوری رفتار سے بھیانک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اس پر سے نکل گیا۔ اب تحقیقات ہو رہی ہے۔

"واقعی بہت بڑا ایثار ہے یہ!" میری زبان سے نکلا اور میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا جسے پولیس والے بار بار پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے اور جس کے درمیان ریلوے پولیس کا اسٹاف ضلع مجسٹریٹ اور کپتان پولیس وغیرہ جانچ پڑتال میں مشغول تھے۔ پلیٹ فارم آدمیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر شخص کیا مسلم اور کیا غیر مسلم جان کی قربانی پیش کرنے والے نوجوان کی

تعریف میں رطب اللسان تھا۔کوئی اسے دیوتا کہتا، کوئی فرشتہ۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کی یادگار قائم کرنے کے لیے سرگوشیاں کررہے تھے۔

نوجوان کی لاش کی حالت بڑی دردناک تھی، لاش کے سر کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ ایک ٹانگ کٹ کر الگ ہوگئی تھی۔ کمر کا حصہ ناگفتہ بہ حالت میں تھا۔ اس وقت کپتان پولیس نوجوان کے کپڑوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے نوجوان کے پتلون کی جیب سے ایک لفافہ نکالا، اسے کھولا لفافے کے اندر ایک پرچہ نکلا۔ پرچے میں لکھا تھا کہ "میں آتم ہتیا (خودکشی) کرنے جارہا ہوں اپنی مرتیو کا ذمہ دار میں خود ہوں۔" کپتان نے پرچہ مجسٹریٹ کو دے دیا۔

کپتان نے پرچہ کے الفاظ آواز سے پڑھ کر سنائے تھے۔ ان الفاظ کا سننا تھا کہ عقیدت کے وہ پھول جو پبلک کی طرف سے نوجوان ...... پر نچھاور کیے جارہے تھے یکدم مرجھا گئے۔ لوگ پیچھے ہٹے۔ اب وہی لوگ جو اسے فرشتہ اور دیوتا کے لقب سے یاد کررہے تھے، چھی چھی، رام رام اور لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے منتشر ہوگئے۔

اس واقعہ کو سترہ اٹھارہ سال ہوگئے، لیکن مجھے اس طرح یاد ہے جیسے اب بھی وہ اسٹیشن، وہ پلیٹ فارم، وہ لوگ اور ضلع مجسٹریٹ وغیرہ میری نظروں کے سامنے ہیں۔ افسوس ہے کہ مجھے اس چھوٹے سے اسٹیشن کا نام یاد نہیں رہا، جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔ تمام اخباروں نے اس خبر کو واضح طور پر شائع کیا افسانہ نگاروں نے اسے موضوع بنا کر افسانے لکھے کسی نے قربانی اور تیاگ کے عنوان سے کسی نے خودکشی کے نام سے۔ لیکن میرا اب یہ خیال ہے کہ اس واقعہ کا حق جیسا کہ ہونا چاہیے ادا نہ ہوسکا اور لکھنے والوں نے وہ صحیح تاثر نہیں دیا جو دراصل اس سے نمایاں ہوتا ہے۔

اب سے سترہ اٹھارہ برس پیشتر میں بھی اس تاثر پر نہ پہنچا تھا لیکن اب جب یہ واقعہ یا حادثہ یاد آتا ہے تو دنیا کے سب سے بڑے صادق نبی کریمؐ کی وہ حدیث یاد آ جاتی ہے جس میں ہے:-

"اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّیَّات"